فیودر داستایفسکی

فیودر دستوئیفسکی

(عظیم روسی ناول نگار)

ظ۔ انصاری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

F. Dostoevsky

By : Zoe Ansari

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1980

دوسرا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت : -/52

سلسلۂ مطبوعات : 753

ناشر : **ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،** ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : میکاف پرنٹرس، ترکمان گیٹ، دہلی-110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

۱۔ پیش لفظ

۲۔ یعنی

9

۳۔ شروعات

47

۴۔ مُصنّف دستوئیفسکی

71

کورے کاغذ سے کالے کاغذ تک

۵۔ عشق بامُراد و نامُراد

106

۶۔ عورت اور دستوئیفسکی

122

۷۔ گھر گرہستی

129

۸۔ بائی کے دس سال

138

۹۔ اسقف اعظم اور حضرتِ مسیح

168

۱۰۔ پوشکن

172

قومی شاعر

۱۱۔ زندگی کی خاص خاص تاریخیں

179

۱۲۔ کتابیات

184

سینٹ پیٹرس برگ کی خانقاہ کے الیگزنڈر نوسکی' قبرستان میں فیودر دستوئفسکی کی قبر

یعنی

ہم لینن گراد کے سب سے اہم نیفسکی قبرستان میں فیودر دستوئیفسکی (مرحوم) کی قبر دیکھنے گئے تو دیکھا کہ لوحِ مزار کیا ہے، گویا زندگی بھر کی فریاد نے، یا یوں کہیں کہ فریاد بھری زندگی نے موت سے اپنا حق وصول کر لیا ہے؛ انسانی تہذیب کے اس مایۂ ناز مصنف کی تمام فکر، تمام فن، تمام سرگرمیوں اور نرمیوں کو پتھر کی لکیر بنا دیا گیا ہے

اسے کائنات کے حُسن اور غم کا شدید احساس بھی تھا، اس کا زبردست تقاضا بھی اور اسی کی آشا میں وہ عمر بھر تڑپتا رہا۔ سو پتھر کے جنگلے میں اس کی چھاتی تلے بے موسم کے تازہ تازہ پھولوں کی ڈھیری رکھی ہے۔ اوپر وہ گہری فکر میں گُم ہے، جیسے وہ دُنیاوی افکار سے کٹ کر اپنے کاغذات کے سامنے، قلم تھامے رات رات بھر گُم رہا کرتا تھا۔ وہی سقراط کا سا چوڑا ماتھا اور پیچھے کو پھیلتا ہوا کاسۂ سر جسے وہ فخر و اضطراب میں بار بار کھجاتا تھا۔ زردی مائل اُجاڑ چہرہ، سُرخی مائل اُجڑے ہوئے بال، موژیک ــــ زروسی گنواروں کے خدوخال، پچکے ہوئے گال، بھوؤں کے اُٹھے ہوئے سائبان کے نیچے دھنسی ہوئی زیرک آنکھیں، ماتھے کی ہڈیاں اور شکنیں دھوپ میں تپتی کیاریوں کی طرح چٹخی ہوئی۔ کنپٹیاں پچکی ہوئی۔ داڑھی مونچھ اور کنپٹی کے چھدرے بال ایک دوسرے میں اُلجھے سُلجھے۔ اور پورے اُداس چوکھٹے میں، اس کے باوجود شدید ہمدردی اور غم گساری کی پرچھائیں تیرتی ہوئی۔

یہ چوکھٹا ادھورا رہ جاتا اگر سنگِ مزار پر صلیب کا نشان بلند نہ ہوتا۔ صلیب کے دستے پر جو زنجیرا پڑا ہے وہ دھرتی میں دبی ہوئی جڑ ہے، یا خود زمین کی قوتِ نشو و نما ہے، وہی "پوچوا" (دھرتی) جس میں جڑ پکڑنے پر وہ اس قدر زور دیا کرتا تھا۔

اس کی فکر کا اصل اصول تھا "پوچوین نست" (Pochvennost) یعنی جڑیلا پن، یعنی اپنی دھرتی پر ایڑیاں جمائے رکھنا اور وہیں سے اُگنے کے لیے شکتی لینا۔ پھر لمبے دستے کے اوپر خاص روسی وضع کی صلیب ہے۔ جسے رومن کیتھولک کلیسائی نشان سے الگ شناخت کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہر پھر کر یہی جتاتا تھا کہ پاپائے روم والی مسیحیت نے اپنے ماننے والوں کو جنّتِ ارضی کا سبز باغ دکھا کر دُنیاداری میں ڈال دیا ہے اور ایک — ایسی مادّیت پرستی کے لیے راہ ہموار کر دی ہے جو بالآخر انسانی محبت کے بجائے سوشلزم کی طبقاتی نفرت کو اپنا لے گی، یوں کیتھولک عیسائی خیالات، تُرک عثمانی اسلام اور مغربی یوروپ کی اشتراکیت تینوں سے بدظن ہونے کے بعد وہ انھیں روسی سلاف مسیحیت کا پیغام دیتا تھا؛ دُور دُور تک پھیلی ہوئی روسی دھرتی میں جڑ پکڑنے والے سیدھے سچے ایمان میں عالم گیر پیغامِ محبت کی شہنائی سُنتا اور سُناتا تھا۔ مسیح کے مصلوب جسم کی سی ستواں صلیب یہاں ایک سنگین علامت بن گئی ہے۔

اس صلیب میں نیچے کا جو حصّہ ہے — جڑوں سے نزدیک اُسے ہم فیودر کی زندگی کے شروع 28 سال شمار کر لیں، جب وہ اوپر کی دھوپ اور ہوا میں اُگ رہا تھا۔ پھر ایک مستطیل تختی سی ہے — وہ چار سال جو اس نے پھانسی کے تختے سے اُترنے کے بعد سائبیریا کی جیل میں کاٹے اور ان چار برسوں کے تیزاب نے اس کے اندر کا بہت سا میل کاٹا۔ پھر بعد کے 28 سال والا حصّہ بلند ہے جو آخری بلندی تک چلا گیا ہے۔ ایک سا، ہموار۔

عمرِ عزیز کے 28 سال ماسکو اور پیٹرسبورگ میں چھوڑ کر، جب فیودر دستوئیفسکی تین ہفتے کی مسافت پر دُور دراز کے قید خانے کی طرف پا بہ زنجیر ہنکایا گیا تو اسے کیا خبر ہوگی کہ وہ حضرت موسیٰ کی طرح پہاڑوں میں آگ لینے جا رہا ہے اور غلامانہ شکنجوں میں گرفتار قوم کے نام غیبی پیغام لے کر لوٹے گا۔ زندگی کے باقی 28 سال اُسی امانت کو طرح طرح سے بانٹنے میں بسر ہونے والے ہیں۔

ترجمانی کا حق

مردم بیزار، ماحول کا پروردہ، بیمار، خلوت پسند، کتاب کا کیڑا، زود رنج،

بدمزاج اور ناتمام مصنف سیاسی ملزموں اور مخدوش مجرموں کے ہجوم میں اوّل اوّل اجنبی رہا، رفتہ رفتہ مانوس ہوا، پھر دن رات اُنھیں کی گالیاں کھانے، طعنے اُلہنے سُننے، اُنھیں کو جاننے، برتنے اور سمجھنے میں بتاکر اس نے کٹھالی کے دہکتے انگاروں میں اپنا سونا صاف کرلیا۔ بعد میں کسی نے لکھا کہ مجرموں کے درمیان وہ اخلاق کا سبق دیتا رہا تو دستوئیفسکی نے سختی سے ٹوکا: "نہیں، میں نے ان کو سکھایا نہیں، ان سے سیکھا ہے ..... میں نے آدم زاد کو، اصل انسان کو، جاندار، کھرے اور دلکش کرداروں کو دریافت کیا ..... گودڑ کے لال پائے ....." بے درد جیلر، کٹر وارڈر اور قیدی، ہٹے کٹے، بظاہر بے حس لوگ، چڑچڑے لوگ، مردم بیزار لوگ، مردم آزار لوگ، اور بات بن بات، بدنصیبی کے گھنے جنگل میں قہقہوں کے شعلے اُٹھانے والے لوگ، سادہ دل مجرم، قابلِ رحم قاتل اپنے پورے وجود کے ساتھ اس نحیف و نزار قلمکار کے شانے سے شانہ رگڑ رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اَن پڑھ کسان ہیں، کمتر لکھے پڑھے شہری جوان۔ باہر ویرانی ہے، اندر اندھیرا، اور اس اندھیرے میں قیدی کی ہستی کنویں میں پڑی کنکر۔ اکثر کی دُکھی آتماؤں میں جھانکنے سے کچھ اور ہی منظر کھُلتا ہے۔ فردِ واحد کی زندگی میں بدن، رُوح اور خیال کا رشتہ کتنا پیچیدہ ہے، کتنے تضادوں میں گرفتار ہے، اس تہ کو وہ پہنچنے کے ساتھ اُس میں، مفکر فنکار میں نیا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ طے کرلیتا ہے کہ گمراہ نسلِ حاضر کو نئی آگاہی بخشنے میں، شعور کو تضادوں کی انتہائی تیز دھار پر چلانے میں، قبولِ عام کی راہ سے ہٹ کر چلنے میں داد یا بیداد سے بے نیاز ہو جائے گا۔ باہر نکلنے کے چار پانچ سال بعد وہ اسی مشن پر روز بروز بلند بانگ ہوتا گیا۔

"یہ آپ کیا روس کے مستقبل، روسی قومی اسپرٹ اور روسی مسیحیت کا راگ الاپتے رہتے ہیں؟" ایک نوجوان روشن خیال ڈاکٹر نے کسی صحبت میں اُسے ٹوکا "آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے روسی جنتا کی طرف سے بولنے کا؟" دستوئیفسکی تلملا کر اُٹھا۔ پتلون کے پائنچے اوپر چڑھالئے، ٹخنے دکھائے۔ بھاری بیڑیوں کے گٹے پڑے ہوئے تھے: "انھوں نے دیا ہے یہ حق۔"

یہ احساس کہ 19 ویں صدی کے وسط کا روس، دسمبر 1825ء کی ناکام بغاوت کے بعد کا روس انسانی تمدن کی تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکا ہے جہاں اسے نئے خیالات کی قوت اور مضبوط اعصاب کی تازہ دَم نسل درکار ہے، یہ احساس تبھی ہو چکا تھا جب اس نے 23 برس کی عمر میں، ادب کو اپنی زندگی کا مشن مان کر سرکاری نوکری چھوڑی اور پہلی تصنیفوں ("بے چارے لوگ" اور "ڈبل") میں روزمرّہ کی بے رونقی میں سے اُن تھکے ماندے افراد کو چُنا جو وہم و خیال اور ٹھوس حقیقت کے بیچ والی دیوار پر ٹنگے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے۔

خیال اور حقیقت، بظاہر کتنے ہی متضاد سہی، لیکن اندر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خیال ایک قوت ہے، عمل کی محرک بھی اور اس میں شریک بھی۔ خیال کے بل پر آدمی پنپتا ہے (چاہے اسے خود اس کا شعور نہ ہو)۔ خیال کی دُنیا اور سچ مچ کی دُنیا کو درمیان سے تراشا نہیں جا سکتا۔ آئیڈیلزم اور ریلزم ایک دوسرے کے خلاف نہیں پڑتے، بلکہ ریلزم (حقیقت پسندی) کو اعلیٰ سطح پر آئیڈیلزم سے فلسفیانہ بُنیاد ملتی ہے۔ انھی معنوں میں وہ خود کو حقیقت پسند کہتا تھا۔

" خالص روحانی دُنیا کے علم کا دعوا کیے بغیر اس نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سچائی کے ساتھ انسانی فطرت کی تصویر کشی میں اس کی خیالی عمارت کو اونچ نیچ سے نہ تو غفلت برتی جا سکتی ہے، نہ برتنی چاہیے۔ انجام کار دستوئیفسکی نے محسوس کیا کہ انسانی ہستیوں کے درمیان تمام رشتے ان کی روحوں کے باہمی ربط سے طے پاتے ہیں، چاہے یہ باہمی ربط ان کے اپنے اپنے خیالات و تصورات کے ذریعے صاف صاف شعوری ہو، یا غیر شعوری، جیسا کہ مرد و زن کی محبت میں ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسے جھجک نہیں رہی موروثی خصوصیات سمیت، حیاتیاتی مظاہر (Biological Phenomena) کو پھر سے جانچنے میں۔۔" (93-10)

مظاہر کو یہ پھر سے جانچنے کا عمل ہی اُسے اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔

آدمی کے ظاہرا وجود کے اندر اُس کا وہ باطنی وجود ہے جو زندگی کی مختلف کشمکشوں، آسائشوں، آزمائشوں، کب کب کی تمناؤں اور ناکامیوں کے خمیر سے بنتا بگڑتا رہتا ہے۔ اس کا اظہار کبھی گہری اُچاٹ نیند کے عالم میں بے جوڑ خواب یا بے تُکے الفاظ میں ہو جاتا ہے۔ کبھی انتہائی اُلجھی ہوئی صورت حال میں اس کے واہمے یا تصور سے، بے ربط قول یا فعل سے ۔۔۔

یا کسی ایسی انہونی حرکت سے، جس کا دُور دُور سان گمان نہیں ہوتا۔ تبھی تو سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) نے اپنے کارنامے "نظریہ تعبیرِ خواب" کی تیاری میں دستوئیفسکی سے نظر حاصل کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ "فنکار کی حیثیت سے دستوئیفسکی کا مرتبہ شکسپیر سے بہت پیچھے نہیں ہے" (98 - 17)۔

شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی تین تہی سائنسی دریافت کا نمبر تو بعد میں آیا، دستوئیفسکی نے فردِ واحد کے قول و فعل میں خواب اور خیالات کا رشتہ پہلے ہی تلاش کر لیا تھا اور اسے زندہ کرداروں کے سانچے میں سمو بھی دیا تھا۔ اِس بارے میں خود ہمارا ناول نگار کیا کہتا ہے؟

"..... یہ خواہ مخواہ کی اَنمل بے جوڑ باتیں، انہونی باتیں، جو یکایک آپ کے خواب میں اُچھل آئیں؛..... آپ نے ان کو جوں کا توں مان لیا، ذرا بھی شک اور حیرت کا اظہار نہ کیا۔ حالاں کہ ان کے برخلاف آپ کے عقل و ہوش کی تیزی طرّاری، نہایت تناؤ کے ساتھ غیر معمولی قوت، دانائی اور منطقی استدلال سے لیس تھی۔ بھلا یہ کیوں کر ہوا کہ جب آپ جاگے، عالمِ حقیقت میں واپس آئے تو ہر بار یوں محسوس ہوتا رہا بلکہ بعض اوقات تو بڑی شِدّت سے محسوس ہوا کہ آپ اپنے خواب کے ساتھ کوئی چیز، اُلجھی ہوئی، معمّہ جیسی کوئی چیز چھوڑ آئے ہیں۔ اِنھی اَنمل بے جوڑ انہونی باتوں میں کوئی خیال ایسا اُبھارہ گیا ہے جو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ مگر سچ مچ کا خیال، آپ کی اصلی زندگی سے جڑا ہوا ضرور تھا کہ پہلے بھی کہیں نہ کہیں آپ کے دل میں موجود تھا اور اب بھی موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نئی اور بہت دُور کی ایسی (Prophetic) بات، جس کا انتظار یا اندیشہ تھا، وہی آپ سے عالمِ خواب میں کہہ دی گئی۔....."

(ناول "ایڈیٹ" سے بحوالہ 14 ــ 5)

خواب و حقیقت کا یہ رشتہ تبھی گرفت میں آسکتا تھا جب ایک فرد کا دوسرے فرد سے، فرد کا سماج سے اور خواب یا دبی کچلی آرزو کا عملی زندگی سے، کھال کا بال سے تال میل دیکھا جائے؛ بدلی ہوئی کیفیتوں میں، تناؤ اور طمانیت، دونوں حالتوں میں فردِ واحد کے باطن کا سائنسی ناپ تول اور فنکارانہ غم خواری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

آدم شناس مرزا غالب، کہ اپنے غم کو چٹکیوں میں اُڑاتا تھا اور دستوئیفسکی، کہ غم کو پال کر، سینت کر رکھتا تھا، دونوں اپنے اپنے مشاہدۂ نفس کی راہ سے اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال

کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے؟

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

اور دونوں کو اَوروں کا، بھوکوں ننگوں کا ہی نہیں، فارغ البال ہم جِنسوں کی روحانی اذیت کا غم کھائے جاتا ہے۔

انسانی فطرتیں اِکہری نہیں، دوہری ہوتی ہیں، وہ ایک دوسرے کی کاٹ نہیں، باہم تکمیل کرتی ہیں۔ جذبات و خیالات کی دو انتہائیں، بظاہر متصادم سرحدیں، پلک جھپکتے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ ایک سے دوسرے میں بدل جاتی ہیں مثلاً انتہائے محبت کا انتہائے نفرت میں بدل جانا اور اس کے برعکس بھی کوئی شخصیت جتنی گہری ہوگی، اتنی ہی پہلو دار، اتنی ہی متصادم کیفیتوں کی آماجگاہ، تضادوں، کی جائے پناہ ہوگی۔ بلکہ ان صفات سے تو شخصیت کے اور چھور کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دستوئیفسکی نے اپنے ایک آدھ کردار کی زبانی اقلیدس کے اصولوں (جیومیٹری کے فارمولوں) کی صداقت سے صاف صاف انکار کیا تھا، اگر نہ کیا ہوتا تب بھی کرداروں کے باطن کی تصویر کشی میں جیومیٹری کا بنیادی اصول، کہ دو متوازی لائنیں کبھی نہیں ملتیں، غلط ثابت کر دیا ہے۔ اُس کے یہاں دو اور دو سے زیادہ متوازی لائنیں کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہیں۔

جذبے کی دو انتہاؤں کو گود میں بھر کر چلنا انسانی فطرت میں دو متضاد سمتوں کا نقطۂ وصال دریافت کرنا، زندگی کے بارے میں جدلیاتی نقطۂ نظر والے فنکاروں کا ایک کارنامہ رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک دوسرے سے قطعی نابلد رہتے ہوئے، بالکل مختلف حالات میں، شمال اور جنوب کے فاصلوں کے باوجود دونوں ہم عصر فنکار تقریباً ایک ہی وقت میں عالمِ فطرت کی اس دُکھتی رگ پہ اُنگلی رکھ دیتے ہیں!:

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

انجمن بے شمع ہے، اگر برق خرمن میں نہیں

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو؟

عاشق صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک؟

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" میں نتاشا نیک طینت، وفا سرشت نتاشا، اپنے ماں باپ سے اور منگیتر سے بے وفائی کرتی ہے اور ایک من موجی کھلنڈرے نوجوان کو دل اور باقی سب کچھ دے بیٹھتی ہے۔ بعد میں نہ اس پر کوئی حرف گیری سہنے کو تیار ہے نہ اپنے کیے پر پشیمان۔ "عشقِ خانہ ویراں ساز" سے جتنی کچھ "اُتھل" "رونقِ ہستی" مل سکے وہ اپنی دیوانی جوانی کا تحفہ شمار کر کے سینے سے لگا لیتی ہے۔ 'ایڈیٹ' کی نستاسیا، مردم گزیدہ حسینہ نستاسیا، دل سے پرنس میشکن کو چاہتی ہے اور چاہت کی خاطر اسے اپنانے کے بجائے ویسی ہی نیک دل، الھڑ، ناز پروردہ "اگلایا" کے ساتھ باندھنے کے لیے سَو سَو جتن کرتی ہے۔ خود کو حیوانی قوت و شدت کے بے دریغ عاشق "رگوژین" کے سپرد کر دیتی ہے۔ خوب جان چکنے کے بعد کہ یہ سودا جان سے چکایا جائے گا۔ نستاسیا کی لاش پر رگوژین اور میشکن دونوں رقیب بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں، ایک کے آغوش میں اس کا بدن آیا تھا، دوسرے کے حصے میں اس کی زخمی روح، پاکیزہ، غمگسار روح کی دھوپ چھاؤں۔

ایسی باتوں سے ہم عصر اور بعد کے بعض قابلِ ذکر ذہنوں نے دستوئیفسکی کو اَبنارمل (Abnormal) کا افسانہ خواں قرار دیا ہے۔ اس کے ناولوں میں مُردار، اُوبڑ کھابڑ، اَینڈے

بینڈے اور نہایت اُلجھے ہوئے کرداروں کے جھمگٹے پر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسے ناول نگار نے تو اسے بالکل ہی رُد کر دیا تھا۔ بعد میں اپنی عمر کے آخری سال The Grand Inquisitor) کا دیباچہ لکھتے وقت صرف اتنی ترمیم کی کہ "ہے تو وہ سدا کا بگڑا ہوا آدمی" ہمیشہ دامن آلودہ، بداندیش —— تاہم حیرت انگیز مردِ خدا (Marvellous Seer) ہے۔[11] جوزف کونرڈ (Joseph Conrad) کو اور میکسم گورکی کو بھی وہ اسی "مُردارپن" کے باعث ناپسند تھا۔ خود اپنے زمانے میں اس نے کم سواد معاصرین کے ہاتھوں کم رسوائی نہیں سہی۔

جس طرح زخمی کوّے پر چار طرف سے کوّے ٹوٹ پڑتے ہیں کیوں کہ وہ ان جیسا نہیں ہوتا۔ ان کے معمول اور معیار سے ہٹ جاتا ہے۔ اسی طرح نارمل کرداروں، رومانٹک ہستیوں اور دھوم دھڑکے والے ہیرو ہیروئن کی بنی سجی پسندیدہ محفل میں دستوئیفسکی کا حال ہوا کہ "ابنارمل" اور مُردار (Morbid) کا لقب اس کے نام کے ساتھ چپکا دیا گیا۔ اور ہم آواز کوّے اس کے لہولہان سر پر ٹھونگیں مارنے لگے۔ شدّتِ احساس کی شکار ہر ایک تہ دَر تہ شخصیت کو بارہا اس آفت کا سامنا ہوا ہے۔ اور دستوئیفسکی نے تو ٹکسالی فلسفوں سے مُنہ پھیر کر خود ہی یہ بلائیں مول لی تھیں۔

ہمارے زمانے میں فرائڈ کے باغی شاگرد ایڈلر (Adler) نے 1918 کے ایک لکچر میں دعوا کیا کہ دستوئیفسکی کی بصیرت علمِ نفسیات کی نگاہ سے زیادہ گہری اتری ہے اور ثبوت میں وہ چار نکات گنوائے جو دستوئیفسکی کی قلم سے ہو کر نفسیات کی سائنس تک پہنچے۔ یہاں ان کا شمار بے محل نہ ہوگا:

اوّل قہقہے کی اہمیت (یعنی انسان کے قول و فعل کے ذریعے اس کی شناخت کرنے کے بہ نسبت قہقہے سے سیرت کی صحیح پہچان کر لینا زیادہ ممکن ہے۔) دوسرے یہ خیال کہ اتفاقی کُنبہ بھی ہوتا ہے جس کا ہر ایک فرد اوروں سے بے خبر اور اپنے میں مگن ہو، تیسرے یہ کہ زندگی میں کسی دماغی روگ کی شروعات آگے چل کر بغاوت کا مقصد بن جاتی ہے، اور چوتھا نکتہ، جو سب سے اہم اور غالباً دستوئیفسکی کا سب سے زبردست انکشاف بھی ہے، یہ کہ محبت اور جنسی محبت، چاہے کتنی ہی پاک پاکیزہ یا بے لوث کیوں نہ ہو، اپنی ساخت میں ہی محبوب (یا محبوبہ) پر پورا قابو حاصل کرنے یا مکمل اختیار پانے کی خواہش ضرور رکھتی ہے۔ اب اگر اس خواہش کی تسکین نہ ہونے پائے تو عین ممکن ہے کہ محبت کے ساتھ ساتھ اس

فریق کی (ویسی ہی شدید) نفرت بھی دل میں بیٹھ جائے ۔

ایڈلر نے کرداروں کے، معمول سے ہٹے ہوئے (اَبنارمل) عمل سے بحث کی ہے ۔ ان کا جواز بتایا ہے، البتہ رونالڈ ہنگلے (Ronald Hingley) جنھوں نے 1960 تک کے تمام تنقیدی جائزوں کو نظر میں رکھ کر دستوئیفسکی کا اصل روپ دکھانے کا دعوا کیا ——— (The Undiscoverd Dostoevsky) کھلے لفظوں میں کہتے ہیں :

. . . اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ تمام بڑے بڑے ناول نگاروں میں وہ اس صفت میں ممتاز ہے کہ اپنی دُنیا آپ ایجاد کی، ایسی دُنیا جو دستوئیفسکی کے قلم سے وجود میں آنے تک ناپید تھی اور اگر اس نے قلم نہ اُٹھایا ہوتا تو ناپید ہی رہتی ۔ اس مفہوم میں بعض انتہائی حیرت انگیز کیرکٹروں کی تخلیق شامل ہے، ایسے کیرکٹر جو شاید ہی کسی انسانی دماغ کو سوجھے ہوں، اور بعض ایسے اوسان خطا کرنے والے واقعات کے اَنت، جو شاید ہی کبھی قلم کی گرفت میں آئے ہوں . . . . . اکثر انسانی وجودیوں تو دستوئیفسکی کے دکھائے ہوئے کرداروں جیسے دکھائی نہیں دیتے لیکن ایک بار اس کی تصانیف پڑھ لیجیے، پھر دیکھیے، حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ (آئے دن) کتنے ایسے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے جو بالکل ویسے ہی ہیں . . . . .

(23 – 228)

اس کتاب کی اشاعت سے کوئی چالیس سال پہلے فرانسیسی دانشور آندرے ژید نے ٹھیک اسی طرف (اپنے لکچر میں) توجہ دلائی تھی :

. . . . . کتنی ساری بیماریاں ہیں، گویا ان کا تب تک وجود ہی نہ تھا جب تک ان کی تشخیص نہ ہو گئی، وہ بیان کے فریم میں نہ آگئیں ۔ کتنے سارے عجیب و غریب امراض کے شکار، اَبنارمل کیس ہمارے اردگرد پہچانے جاسکتے ہیں، بلکہ باہر نہیں، ہمارے اندر موجود ملتے ہیں ۔ بس ذرا دستوئیفسکی کو پڑھ کر کھلی آنکھوں دیکھنے کی دیر ہے ۔ ہاں، مجھے پورا یقین ہے کہ دستوئیفسکی بعض مظاہر پر ہماری آنکھیں کھول دیتا ہے ۔ مطلب یہ نہیں کہ وہ مظاہر محض اتفاقی (یا اِکّا دُکّا) ہوتے ہیں ۔ نہیں، وہ تو موجود تھے ۔ ہم نے ہی ان کی طرف سے آنکھیں موند رکھی تھیں . . . . .

(3 – 107)

یہ ہے 'ابنارمل' کی حقیقت۔ اور معقولیت کو مضحکہ خیز بنانے والی سوسائٹی میں کون ابنارمل نہیں ہوتا؟ مریل، لکیر کا فقیر، بے عقلی کے ساتھ انتہائی فرماں بردار اور بے سمت و صدا جینے والا، جس سے ہستی کے گڑھے پٹے پڑے ہیں۔ "روپوش آدمی" (جو خود کم و بیش دستوئیفسکی ہے) خود کلام افسانے میں کہتا ہے: یقین کیجئے گا حضرات کہ بہت زیادہ با شعور ہونا ایک طرح کا روگ ہے۔ سچ مچ کا نیک طینتی اور بھلمنساہٹ کی جان کا روگ۔ روزمرہ کے معمول پورے کرنے کو معمولی انسانی سمجھ بوجھ رکھنا ہی بہت کافی ہے۔ یعنی ہماری بدبخت انیسویں صدی کے ایک ذہین آدمی کو جتنا شعور نصیب ہوتا ہے' اس سے آدھا، بلکہ چوتھائی بھی (عملی زندگی بسر کرنے کو) بہت ہے .....'

یہی آدھی بلکہ چوتھائی ہوشمندی والے ہیں جو کامیاب اور "نارمل" زندگی کی گاڑی کھینچے چلے جاتے ہیں اور انھیں دستوئیفسکی نے پس منظر کے گرد و غبار میں نمایاں کرکے، نارمل اور ابنارمل کرداروں کا اصلی حلیہ شناخت کرایا ہے۔

دستوئیفسکی نے ڈھلے ڈھلائے (روسی) کرداروں میں سے خاص "ٹائپ" نہیں چنے بلکہ بڑے سیدھے سچے، یا گہری لیکھ سے ہٹ کر چلنے والے (" لیکھ چھوڑ تینوں چلیں : ساعر، سینھ، سپوت") ذرا "بگڑے ہوئے" کردار چن لیے۔ انھیں فرزیں بنایا اور ان کے پیچھے پیادے کھڑے کیے، جو فرزیں کو گرانے یا بچانے میں کام آئیں۔ "جرم و سزا" ناول میں رسکول نیکوف نپولینی طریق کار ('میں اپنے ارادے اور قوت کا مالک ہوں') کا نمائندہ ہے، جو دو خون کا بوجھ گردن پر لیے پھرتا ہے۔ وہ ناول کا ہیرو ہے۔ اسے راہِ نجات دکھاتی ہے سونیا، ایک شرابی قمار باز باپ کی جسم فروش بیٹی۔ تو کیا وہ ہیروئن ہے؟ کیا یہ سیدھا سادا، سفید و سیاہ (خیر و شر) کی کشمکش کا سبق آموز قصہ ہے؟ نہیں؟ دستوئیفسکی اس ذہنی سطح سے گزر چکا جہاں سفید و سیاہ کا سامنا رہتا ہے، یہاں تو بیک وقت سفید و سیاہ کی ملاوٹ ہے۔ نہ کوئی ولی ہے نہ شیطان۔ انسان کا دل یزداں اور اہرمن کا میدانِ کارزار ہے۔ بدلتی ہوئی صورتِ حال میں، زمین کے گولے کی گردش کے ساتھ، سیرتوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ قمار باز شرابی مرمیلا دوف قابلِ رحم بے بس باپ ہے، جسم فروش بیٹی محبت کے قابل پاکیزہ آتما۔ "ایڈیٹ" کی تیز طرار نستاسیا اپنے سوداگر بچہ عاشق کے ساتھ شعلہ ہے اور نازک پرنس میشکن کے ساتھ شبنم۔ "برادران کراما زوف" آخری

ناول میں، جہاں پچاس کیرکٹروں کا جھرمٹ ہے، یہ کشمکش انتہا کو پہنچ جاتی ہے کیوں کہ وہاں ایک مجموعۂ صفات باپ کے لہو کی ساری لرزشیں، ساری خصلتیں ایک ایک کرکے چاروں بیٹوں میں بٹ گئی ہیں۔ بڑا بیٹا دیمتری، جسم ہے، خواہشات کا پالنے والا، ایوان مُشکّک بے عمل ہے، دماغ کے کہے میں بھٹکنے والا، الیوشا آتما ہے، وجدان کے سرچشمے سے سیراب ہونے والی اور سمردیاکوف، حیوانی قوت ہے، محض عمل ہے، کسی بھی حکم یا خواہش کی تعمیل سے سروکار رکھنے والی اندھی قوت ـــــ اور پھر تین عورتیں ہیں، متضاد جذبوں کی شکار، خود آزار ـــــ کوئی زندگی کو دل لگی سمجھ کر نبھاتی ہے، کوئی اسے امتحان گاہ شمار کرکے ہر طرح کی آزمائش کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ کئی کردار محبت اور نفرت کے دو پاٹوں کے بیچ مستقل پستے رہتے ہیں۔ ایک اہم نسوانی سیرت ہے، اوسط درجے کی، لیزا۔ وہ اپنی ہستی کو مٹا دینے اور دوسروں کا مذاق اُڑانے کی عادت سے، لطف و کرم اور قہر و غضب کی خصلت سے، محبت کا جواب تحقیر سے دینے سے باز نہیں آتی۔ دونوں پہلو ایک ساتھ (گرم) رکھتی ہے۔ (دونوں بھائیوں) ایوان اور الیوشا سے تعلقات بنا رکھے ہیں..... ایوان اس لیے پسند ہے کہ اس کی چاہت میں اپنی جان پر ستم سہنے کی آس لگی رہے اور الیوشا اس وجہ سے کہ محبت کے رشتے سے وہ خود اس پر ستم ڈھا سکے گی۔"

(9 - 359 60)

درست کہ دستوئیفسکی نے "ابنارمل" کو اُبھارا، جس طرح خوردبین ایک پھیلے ہوئے بڑے سے نقشے میں کسی ایک مقام پر، ایک نقطے پر آکر تھم جائے اور مُحدّب شیشہ اسی چھوٹے سے منظر یا زیریں منظر کو اتنا اُبھار دے کہ وہی مرکزی حیثیت پا جائے؛ بس، یہاں دیکھیے، یہ ہے اصل شے! آس پاس کا باقی منظر ڈھک نہیں جاتا، بلکہ پس منظر کے کام آتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس نے سوسائٹی میں سے مستقل ٹائپ کو عموماً نظر انداز کیا، لیکن اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو کردار اس نے چُن دیے، جن خاکوں میں رنگ بھر دیا، وہی وقت گزرنے کے ساتھ مستقل ٹائپ کی صورت، سیرت اور اہمیت اختیار کرتے گئے۔ افسانوی ادب میں اُن کے امر ہو جانے کا راز صرف یہی نہیں کہ انھیں ذہن نشین کرنے کے لیے دماغ کھپانا، ذہنی ورزش کرنا لازم ٹھہرا بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کے تخلیق کرنے والے کو ان کے جسموں کی ہی نہیں، روحوں کو بھی فکر لگی رہتی ہے، اور اس کے علاوہ، انسان اور انجانی، ماورائی حقیقت کے درمیان رشتوں پر بھی

وہ نظر رکھتا ہے۔"

(4 - 321)

اَبنارمل کرداروں کو سڑک یا ڈرائنگ روم سے اُٹھاکر جوں کا توں رکھ دینے کے بعد ان کے باطنی وجود کے تقاضے ماننا، ان کے منشا کے آگے خود سر جُھکا دینا، اپنے اصل پلان سے ہٹ کر بھی ان کی ضد پوری کرنا ہمارے پیچ در پیچ مصنّف کی فنی بصیرت کا کھرا پن ہے۔ اس نے اپنی ہستی اور ماحول، دونوں کی ساری ناہمواریوں کے جھٹکے سہہ کر ادب کے اعلا تقاضوں سے سچّا سودا رکھا۔ ادب میں، زیبِ داستان کی خاطر تو کچھ نہ کچھ جھوٹ سچ مِلانا ہی پڑتا ہے (اور اسے جھوٹ نہیں مبالغہ کہتے ہیں) دستوئیفسکی نے بھی جیتے جی ادب میں جھوٹ بولا لیکن ادب سے ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔ وہ خاص معنوں میں ایک حقیقت پسند فنکار تھا۔

"ہے کہاں تمنّا کا دُوسرا قدم یارب؟"

دستوئیفسکی نے کئی موقعوں پر ("ایڈیٹ" ناول میں میشکن کی زبانی افسانوی رنگ میں، اور ڈائری میں براہِ راست بیانِ واقعہ کے انداز میں) دو نہایت بحرانی لمحے ایسے بیان کیے ہیں جن کا عمر کے باقی برسوں کے کام پر گہرا اثر پڑا۔ ایک وہ لمحہ جو پھانسی چوک کے تختے پر چڑھنے کے بعد، زندگی اور موت کے درمیان پتلی سی لکیر کی طرح اُبھرا اور وعدہ لے گیا کہ اب اگر جینا نصیب ہوا تو وقت کی قدر جانے گا اور ایک ایک دن کی رگ سے فکر و عمل کا سارا رس چوس ڈالے گا۔

پکّے جواری نے اپنا قول نہیں ہارا۔ اور غموں میں ڈوبی ہوئی کائنات کے سارے غموں کو قطرہ قطرہ اپنی رگوں میں ٹپکا لیا۔

دوسرا لمحہ مِرگی کے حملے سے ذرا پہلے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کا، جب وجود، جسم، روح، ہر منظر، ہر ایک مظہر، ہر ایک رنگ اور سارے آہنگ گھُل مِل کر دل و دماغ کو بُقعۂ نور بنا دیتے ہیں؛ الہامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، فرد اور پوری کائنات کے درمیان مکمّل ہم آہنگی، غیبی ہم آہنگی (Harmony) کا احساس ہوتا ہوگا۔ اس مکمّل ہم آہنگی کو وہ "حُسنِ بے نہایت" قرار دیتا ہے۔ اور حُسن کا یہی تصوّر ہے جسے وہ بدشکل، بدباطن سماج کی نجات کی سبیل بتاتا ہے۔ "حُسن دُنیا کو بچالے گا" یہ وہ اپنے پسندیدہ کرداروں کی زبانی بار بار کہلواتا ہے۔

غم اور حُسن، یہ دو ستون ہیں جن کے درمیان فنکار کی روح جھولتی ہے، غم

اِک آگ کا دریا ہے او رتیر کے جانا ہے

روحِ انسانی پر گناہ کا بوجھ ایک ایسا گند ہے جسے غم کی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اور انسان دُھل دُھلا کر معصوم بچّے کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اُردو فارسی شاعروں میں غالبؔ سے زیادہ کسی نے غم کے فلسفے کو نہیں کُریدا اور نہ اس کی روح پر اپنا تجربہ کر کے دیکھا۔ وہ غم کو خِرد آموز کہتا ہے۔ فن کی جان کہتا ہے اور فنکار کا ایمان بتاتا ہے۔ دستوئیفسکی نے اپنے غم کو اَوروں کے غم میں ڈال کر، اور اس عمل کو اُلٹ کر یہ جانا کہ چاہے جُرم ہم سے سرزد ہوا ہو، یا ہمارے ایما سے، ہماری ڈھکی چھُپی خواہش اس عمل میں شامل رہی ہو، یا ہمارا تغافل، یا ہماری خاموشی اور سہار۔ بہر حال

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے

ہم مُجرم، ہمارا ضمیر مُجرم اور ہمارا شعور قصوروار۔ اب نہ ظاہرداری اور قانونی پردہ داری اس بوجھ کو گردن سے اُتار سکتی ہے۔ نہ ہماری ہوشیاری اور معیارِ اخلاق کی عیاری۔ محض اقبالِ جُرم اور اس کی سزا قبول کرنا، خود کو اذیت کے انگاروں پر سے ننگے پاؤں گزارنا ہی آدمِ خاکی کی فطرت کو تبسمہ دے سکتا ہے اور ـــــ توبہ کا در ہمیشہ کھُلا رہتا ہے۔؟

آبائی مذہب کی یہ سیدھی سچّی تعلیم اس پر جیل میں ملزموں اور مُجرموں سے مِلنے ملنے، غمزدوں کو گلے لگانے اور ان کے باطن کا جائزہ لینے کے ساتھ کھلتی گئی۔ باہر نکلتے ہی اس نے بھائی کو ایک خط میں لکھا:

> "میری روح پر، میرے ایمان و عقیدے پر، دل و دماغ پر ان چار برسوں میں کیا کچھ گزر گیا، وہ کن کن مقامات سے گزرے، بتا نہیں سکتا۔ لمبی کہانی ہے۔ تاہم ہمیشہ کی یکسوئی، دھیان کی کیفیت، کڑی اور کڑوی حقیقت سے فرار کر کے اپنے اندر پناہ لینا میرے بہت کام آیا...... اب دیکھو، کتنے ہی ایسے تقاضے ہیں، کتنی ہی ایسی تمنّائیں جاگی ہیں (مجھ میں) جن کی طرف پہلے کے دنوں میں خیال تک نہ گیا تھا......"

وہ کون سی تمنّائیں تھیں جو شدید جسمانی اذیت اور ذہنی ہلچل کے ساتھ بیدار ہوئیں؟ کیا حقیقی دوزخ سے خیالی جنّت کی جانب فرار کی تمنّا، جلوت سے خلوت کی سمت، معروف سے

مبھول کی طرف نکل بھاگنے کی آرزو، ترکِ رسوم اور ترکِ ہجوم کے، یا مراقبے کے، دھیان گیان کے تقاضے ہیں؟ کچھ یوں بھی ہے اور بہت کچھ اس کے سوا بہت کچھ میں انسانی شخصیت اور شناخت کی تلاش ہے۔ ٹھوس عقیدے کی جستجو ہے، دم سادھے ہوئے بے قرار سوچ ہے، فرد اور سماج کے درمیان ایسی ہم آہنگی کی تمنا ہے جو بھٹکی ہوئی روحوں کو راحت کی راہ دکھا سکے۔

آدمی کے دل کا ناسور اس نے قریب رہ کر، شریک رہ کر دونوں جانب سے دیکھا تھا: انفرادی حیثیت میں عام روسی کیرکٹر انتہا پسند ہے، پینے پر آئے گا تو رُکنے کا نام نہیں لے گا، جان دینے کا فیصلہ کرے گا تو دائیں بائیں نہیں دیکھے گا۔ نہ جبر میں کسی حد کو مانتا ہے نہ اختیار میں۔ رحم میں بے پناہ، ظلم میں بے محابا؛ محبت میں، نفرت میں، کسی بھی لت میں بے دریغ، احتیاط سے فارغ، توازن سے بے فکر، منچلے بچوں کا سا دل رکھنے والا روسی کسی بھی رَو میں بہہ نکلتا ہے یا بہایا اور بہلایا جاتا ہے۔

لیکن اجتماعی مزاج میں وہ نہایت فرماں بردار، ایک دوسرے کا غم خوار، اُخوت کا پرستار ہے، صابر و شاکر اور جماعتی ڈسپلن کا سخت پابند، کٹر مذہبیت ہو یا انتہا درجے کی لامذہبیت، جو نظریہ اس کے گلے اُتر جائے وہ بے چوں و چرا اس پر جان قربان کر دے گا۔ اگر کہیں کسی نظریے یا فلسفے یا سماجی تحریک میں اسے اپنی سرحدوں سے پار انسانی برادری کی فلاح نظر آجائے تو اسے بزورِ شمشیر پھیلانے میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔

دستوئیفسکی نے اپنی اس تشخیص کو طرح طرح سے پیش کیا ہے اور اسی "مریض" کے لیے عقیدے کا، ایمان کا آزمودہ نسخہ تجویز کر کے اس کے اجزا دُنیا جہان میں ڈھونڈھتا پھرا ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیت، بلکہ متصادم کیفیات سے باخبر ہے۔ بُزرگ خاتون مادام فون ویزن کے نام 1854ء کے ایک خط میں لکھتا ہے:

> "..... میں اپنے زمانے کا فرزند ہوں۔ بے یقینی اور بے عقیدگی کا شکار آج تک رہا ہوں (اور مجھے خوب معلوم ہے کہ) مرتے دم تک رہوں گا۔ یہ جو عقیدے کی تشنگی ہے، اس نے مجھے کیسے کیسے کنویں جھنکاتے ہیں، کتنے عذابوں میں ڈالا ہے، اور جس قدر اس کے خلاف دلیلیں سوجھتی ہیں، عقیدے اور ایمان کی یہ پیاس

اتنی ہی اور بھڑکتی ہے.....“

پختہ عقیدہ ہے جو دُکھی آتما کو کمزوری کے لمحوں میں سہارا دے گا اور جتنا وہ اجتماعی ہوگا اتنا ہی قوت کا سر چشمہ بنے گا۔ قید سے رہائی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتا ہے :

”..... تاہم غیب سے مجھے ایسے لمحے عطا ہوتے رہتے ہیں جن میں مکمل سکون نصیب ہو۔ ان لمحوں میں محبت کرتا ہوں اور محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے محبت کی جارہی ہے۔ ایسے ہی لمحوں میں میرے دل کے اندر ایمان کا نشان راہ پاتا ہے جس کے سبب ہر شے روشن اور پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ یہ نشان بالکل سادہ سا ہے، صرف اتنا یقین رکھنا کہ دُنیا میں کوئی ہستی حضرت مسیح سے زیادہ حُسن و جمال کا پیکر، زیادہ پائدار، زیادہ قابلِ محبت، زیادہ معقول اور ہوشمند، زیادہ حوصلہ مند اور مکمل ہرگز نہیں۔ ہاں، میں تو رقابت کے جوش میں یہاں تک اپنے آپ سے کہہ لیتا ہوں کہ نہ ایسا ہوا نہ آئندہ ہونے والا۔ مزید یہ کہ اگر کوئی مجھ پر ثابت کردے کہ مسیح کا کوئی اصل وجود ہی نہیں اور یہ بھی کہ حق کو مسیح سے کوئی نسبت نہیں تو میں حق سے پھر جاؤں گا، مسیح سے نہیں پھروں گا.....“

”بے یقینی کے فرزند“ نے اس ”یقین“ کو آنکھ بند کرکے یونہی نہیں اپنالیا۔ وہ رائج سکوں اور کسوٹیوں کی کھوج میں سر کھپاتا پھرا۔ پہلا موقع میسر آتے ہی وہ مغربی یوروپ کی طرف نکل گیا۔ برلن، لندن، پیرس۔ سماج کے سرمایہ دارانہ ارتقا اور سامراجی ہما ہمی نے، پُرشور اور بے مروت شہروں میں، زمین سے اُکھڑے ہوئے درمیانی طبقے کے وہ کردار اُگل دیے تھے جنھیں اپنی ذات اور ذاتی مفاد کے کسی خیال میں معقولیت نہیں دکھائی دیتی تھی۔ بقول جارج لوکاچ (G. Lukacs): اس زمانے (19 ویں صدی کے نصف آخر) میں مغرب کے بورژوا ادب پر یہی ٹائپ چھایا ہوا تھا۔ چاہے اسے قبول کیا جائے یا رَد کیا جائے، اسے دلکش دکھایا جائے یا خاکہ اُڑایا جائے۔ ہر پھر کر وہی شخص (عوام کی زندگی سے کٹا ہوا تنہا شخص) ہی موضوعِ سخن رہتا ہے. فلابیر (Flaubert) اور اِبسن (Ibsen) جیسے نہایت عظیم مصنف بھی اپنے ہاں ان کرداروں کی سماجی بُنیاد

میں اُترنے کے بجائے ان کے نفسیاتی اور اخلاقی شاخسانے زیادہ اُبھارتے ہیں۔ . . . .
(—154)

مگر دستوئیفسکی نے ان کی سماجی بُنیادوں کو بھی ٹٹولا اور یہ پایا کہ یوروپ کی تہذیب کو کئی جان لیوا روگ لگے ہیں جن میں زرپرستی سب سے شدید ہے۔ اسی زرپرستی اور مفاد پرستی نے، تعلیم یافتہ طبقے میں خودنگر، خود پرست، اخلاقی ذمہ داری سے مُنکر، کچھ بھی کر گزرنے والے سنگدل کردار عام کر دیے ہیں جو کسی بھی سماجی توانائی کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگ ہر تحریک کے لیے وبالِ جان اور ہر تمدن کے لیے بے فیض ہوں گے۔

مغربی یوروپ ــــ اور اس کا مستقبل

مغربی یوروپ کا تمدن 19 ویں صدی کے نصف آخر میں نہ صرف سرمایہ دارانہ ارتقا کے سامراجی عروج کو، بلکہ اندرونی تضادات کی انتہا کو بھی پہنچ چکا تھا۔ اسی زمانے میں محنت کشوں کے طبقاتی نظریے اور انقلابی تحریکیں، روپوش اور کھُلے عام تحریکیں بھی اسی نسبت سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ دستوئیفسکی کا روس ٹھیک اسی سمت میں ٹُھمک رہا تھا۔ مصنف کا ماتھا ٹھنکا، اس نے دس برسوں میں یوروپ کے تین پھیرے اور کم و بیش ساڑھے چار سال بسر کیے۔ انٹرنیشنل جلسوں کی گرما گرم تقریریں سُنیں۔ روسی جلاوطن انقلابیوں اور دانش وروں سے مِلا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ افادیت پسندی (Utilitarianism) نے جس طرح معاشیات میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور سیاسی، سماجی سطح پر خود غرضی کا سکّہ چلا دیا، اسی طرح طبقاتی انقلاب کو آخری منزل مان کر جو دہشت پسند، نراجی یا روپوش تحریکیں چلائی جائیں گی۔ وہ بالآخر سازشی ذہنوں، اقتدار پسند سیرتوں اور ہوشیار سیاست دانوں کو بے رحمانہ فیصلے منوانے، گٹھ بندی سے اپنا اثر جمانے اور ہر قسم کے انسانی اصول سے آزاد کر کے جوانوں کو کھُلی چھُٹی دے دیں گی کہ وہ "ذریعوں" یا "طریقوں" کے جائز و ناجائز سے بے نیاز ہو کر، اپنا اختیار ثابت کرنے کے لیے جو چاہیں کر گزریں ـــ وہ چاہے کل کے رفیقوں کا خفیہ قتل ہو یا کردار کُشی یا پھر خودکشی۔

روسی دانشور معاصر چرنی شیفسکی (Chernoshevsky) کا نظریہ کہ آدمی اندھا خود غرض نہیں ہوتا بلکہ اس کا قول و فعل اپنے ذاتی اور گروہی مفاد کو ہوشمندی کے ساتھ بچانے اور آگے بڑھانے کی نیت سے طے پاتا ہے، تعلیم یافتہ طبقے میں جگہ بنا رہا تھا۔ باکونین (Bakunin) کا نظریہ کہ جب تک طبقوں میں بٹے ہوئے سرمایہ دارانہ سامراجی نظام مغرب کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی جائے، جب تک ہر قسم کی اتھارٹی (اقتدار) کا اعتبار دلوں سے نہ اٹھا دیا جائے، بادشاہوں کے تاج و تخت کو ٹھوکروں میں اڑا کر ایک عام نراجی فضا نہ بنادی جائے، کوئی انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا، یہ نظریہ گرم مزاج نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مارکس اور اینگلس، بلانکی اور پرودھوں کے طبقاتی انقلابی نظریے، اگرچہ مغربی یوروپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں زور پکڑتے جا رہے تھے، تاہم روس کے باخبر حلقوں میں بھی ان کی گونج سنائی دے جاتی تھی۔

ان کے علاوہ خود روس میں خیالات کی کتنی لہریں رواں تھیں: "سلاوو فِل" وہ جو سلاف نسل والوں کی قومی عظمت اور سودیشی رہن سہن کے گن گاتے گاتے بے سُرے ہو چکے تھے، ان کی جگہ "نرودنکوں" (Narodniki) نے لے لی تھی، یعنی عام جنتا کی راہ اپنائی جائے، وہی قوت و عظمت کا سرچشمہ ہے۔ "سرفڈم" کے قانونی خاتمے کے ساتھ صدیوں کی رعایا اُٹھ کھڑی ہوئی تھی، اور شہر کے بیوپاریوں، سودیشی مال تیار کرنے والوں، دلالوں اور وکیلوں کے لیے واقعی دولت و قوت کا دفینہ، خزینہ بن گئی تھی۔ اسی کھیت سے نئی فصل اُگی: "پوچ وینیکی" کی؛ اُسے ہم اپنے یہاں کا "گاندھی واد" کہہ سکتے ہیں جس نے معتدل آزادی پسند لبرلوں (مثلاً ایشور چند، موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، وٹھل بھائی پٹیل) کے دمدموں پر توپیں چڑھائیں اور عوام کو اپنی صفوں میں کھینچ لیا۔ ان کا بڑا مرکز اونگھتا ہوا پرانا پائے تخت ماسکو تھا۔ مغربی سرمایہ دارانہ تمدن کے نتیجوں سے بیزاری کا اعلان کرنے والے ان تمام گروہوں کے برخلاف روس کا مغرب پسند حلقہ اُٹھا، یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ، باہر ملکوں میں گھومے ہوئے فوجی افسر، جدید فلسفیانہ اور معاشی رسائیوں کے رسیا، ریڈیکل لوگ ان کا ذہنی مرکز، نئی یوروپی انداز کی راجدھانی پیٹرسبورگ تھی۔ اور دستوئیفسکی کے اوّلین رفیق، باخبر اور بااثر دوست یہیں تھے۔ دستوئیفسکی نے اپنے تازہ ترین "جنتا پریم" عوام پرستی یا مادرِ وطن کی پرستش میں انھی سے

جُدائی اختیار کی۔

یہ زمانہ، سائبیریا سے باہر نکلنے، پیٹرسبورگ واپس آنے اور یوروپ گھومنے کی دہائی، دستوئیفسکی پر شدید ذہنی کشمکش کی گزری ہے۔ استرآخت کا بیان ہے کہ اگرچہ وہ دیکھنے میں آرام طلب تھا، لیکن ان دنوں روز و شب کام میں، خیالات کے ہجوم میں، اندرونی اُلجھاؤ میں گرفتار رہتا تھا۔ اسے اپنے محشرِ خیال سے اتنی بھی مہلت نہیں ملتی تھی کہ یکسوئی کے ساتھ قلم سنبھال کر بیٹھ جائے، تاہم اس عرصے میں جو تین ناول آئے۔ تینوں اس اندرونی دھوپ چھاؤں سے اور خیالات کے ایک نہج پر اُستوار ہونے کی عبوری حالت سے نہ صرف آگاہ کرتے ہیں بلکہ روس کے قید خانوں کے اندر اور مُلک کی سرحدوں سے باہر اس کی ذہنی دوڑ اور اس بے قرار تلاش کا بھی پتہ دیتے ہیں جس کے پسینے سے بڑی تصنیف کا آٹا گوندھا جاتا ہے۔

"مُردوں کے گھر کی یادداشتیں" میں وہ گودڑ کے لال "عوام" کو ان کی تمام خوبیوں اور خامیوں، خواہشوں اور خارشوں کے ساتھ اُبھارتا ہے؛ "موسمِ گرما کے تاثرات پر سرما کے اندراج" میں یوروپ کے تاریک مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہے، تورگینف سے گرما گرمی میں یہاں تک کہہ گیا کہ تم، مغرب پرستی میں اتنے اونچے چڑھ گئے ہو کہ روسی آدمی کا قد چھوٹا اور حُلیہ دُھندلا نظر آتا ہے۔ اتنا کیا ہے تو پیرس سے ایک دوربین بھی منگوالو کہ پورے قد کا روسی دکھائی دے، اور "روپوش آدمی کی یادداشتیں" میں اس نے پوری تلخی کے ساتھ زر پرست سماج میں فرد کی زخمی شخصیت کی ٹریجڈی دکھائی ہے۔ لکھنے والا "روسی یوروپین" اپنے مُلک کے ماضی اور یوروپ کے حال کو ایک ساتھ مستقبل کی خیالی تصویر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مسئلہ وہی درپیش ہے جو اپنے اپنے وقتوں میں فلسفی غزالی اور کانٹ کو پریشان کرچکا ہے۔ سائنس کی بُنیاد عقلی تحقیق، دلیل و ثبوت پر ہے تو پھر فرد کی فکری آزادی کا کیا حشر ہوگا؟ انسان، جو اپنے خیالوں میں ہر قید و بند سے، باہر کے دباؤ سے، دلیل و ثبوت سے آزاد، یہاں تک کہ زمان و مکان کی حدبندیوں سے باہر نکل کر سانس لیتا ہے، کیا اسے سائنسی اختیار بڑھنے کے ساتھ، عقل کا حوصلہ اور دعوا بلند ہونے کے ساتھ ساتھ خودکشی کرنی ہوگی؟ عقل اور وجدان کے درمیان رسّہ کشی میں انسانی آزادی کے لیے کون سی راہ کھلی ہے، اختیار کی راہ؟ لیکن اگر اختیار کے ہاتھ میں "بے خدا" سیاسی دہشت پسند فلسفے کا ہتھیار دے دیا گیا تو پھر خیر و شر کا امتیاز ہی اُٹھ جائے گا۔

ایسا فرد، اپنی قوت اور گروہ بندی کے بَل پر ترازو اور باٹ دونوں بدل ڈالے گا اور بے لگام آزادی، خود پرست آزادی خود اس کے لیے روحانی آسیب بن جائے گی۔"

" نفسیاتی تجزیے کے فن میں باکمال دستوئیفسکی نے (یکے بعد دیگرے کرداروں کے ذریعے) دکھایا کہ مستقل طور سے مصیبت بھرنے اور صلاحیتوں کے کچلے جانے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ آدمی کی آتما تہس نہس ہو جائے، شعور خاک میں مل جائے؛ نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو وہ خود کو ہیچ پوچ شمار کرنے لگے، دوسری طرف اس میں شورش اور سرکشی کا مادہ پکنے لگے۔

(2 - 762)

پہلے، تصور سے وہ بھلے مانس پیدا ہوتے ہیں جو داہنے گال پر طمانچہ کھانے کے بعد بایاں گال بھی پیش کر دیں، یا پھر وہ نکھٹے لوگ، جو دوسروں کے منشا کی بے چون و چرا تعمیل میں عمر تیر کر جائیں، مگر دوسرے پہلو سے انتقامی مزاج اُٹھتے ہیں۔ سماج کے مقررہ اصولوں اور فارمولوں کو توڑ پھوڑ کر اپنی ہستی کا اثبات کرنے والے، سادہ دل نوجوانوں کو اپنی سواری بنانے والے، جرائم پالنے والے، والکوسکی جیسے چالباز اور عیش امروز پر مرمٹنے والے، رسکول نیکوف جیسے بھولے قاتل، گانیا ایولگن جیسے کیریرسٹ، رگوژین جیسے مردم آزار، اذیت پسند خبطی۔ اور آخر میں فطرت کا قانون اپنا بے رحم فیصلہ سناتا ہے۔ "سدا سہاگی" ناول میں دستوئیفسکی اپنے خاص کردار ولچانی نوف کی زبانی کہتا ہے:

> ..... فطرت کو شیطنت گوارا نہیں..... فطرت پاجی پن کے لیے رحم دل نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے..... پہلے تو وہ بد وضع اولاد پیدا کرتی ہے اور پھر ترس کھانے کے بجائے اسے سزا دیتی ہے، جیسا جُرم ویسی سزا.....

"حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"

(اقبال)

"جُرم و سزا" ناول تک پہنچتے پہنچتے، گویا دستوئیفسکی نے ہیرو کی نفی (رُو پوش آدمی Anti Hero) سے لے کر منفی ہیرو (Negative Hero) تک کا فاصلہ طے کر لیا، جتا دیا کہ منفی سماج کے خمیر سے اس قماش کے منفی کردار ہی اُبھر سکتے ہیں۔ اب وہ اپنی پٹری پر آگیا۔ آگے چل کر "بھوت پریت" میں اس نے نیک نیت، بد نیت، جفاکش، آرام طلب، فلسفیانہ اور کھوکھلے منفی کرداروں کا ڈھیر لگا دیا۔ مغرب پرستی سے اپنی بیزاری کو، سازشی گروہوں کی انقلابی

سرگرمیوں، خفیہ نراجی دہشت پسندی، سائنسی سوشلزم اور دہریت، سب کو ایک نظر سے دیکھا اور سب کے رشتے ایک دوسرے سے جوڑ دیے۔ یوں، اپنی دانست میں، ہر ایک نفی کی نفی کر دی۔

——غلط ہے کہ انسانی سماج پر افادیت کا نظریہ حاوی ہے۔ انسان اپنے وجود کی شناخت طلب کرتا ہے۔ ہاں، شناخت۔ اور اس کی خاطر وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتا ہے۔

——غلط ہے کہ نفع و ضرر کے بازار میں آدمی ہوشمندانہ نفع کی راہ پر چلتا ہے۔ اسے نیکی کی راہ سمجھا دی جائے تو وہ اس پر ہو لے گا۔ نہیں وہ اپنی ہستی کا اثبات چاہتا ہے اور اس کی خاطر اپنا نقصان، اپنی بربادی بھی خرید لے گا۔

——غلط ہے کہ عقل اس کی رہنما ہے، عقل کا جوہر جنون کے شعلے سے، ہوش کی قندیل جوش کی آندھی سے اور معقولیت کی آنکھ شدتِ جذبات سے بے نور ہو جاتی ہے۔

——غلط ہے کہ فطرتِ انسانی کو جنتِ ارضی کا سبز باغ دکھا کر بدلا جا سکتا ہے۔ نہیں، بلکہ اُسے احتسابِ نفس سے گزار کر، غم کی سزا دے کر ہی قلبی راحت کی منزل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ "غم منزل نہیں، راستہ ہے لیکن جیتے جی اس سے نجات ممکن نہیں۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں"۔ یہیں سے حیاتِ تازہ (Resurrection) کا راستہ کھلتا ہے۔

——غلط ہے کہ مادی ترقیوں اور سائنسی دریافتوں کے ساتھ مغربی تمدن رفتہ رفتہ پورے عالمِ انسانیت کا ہمہ گیر مذہب (Augusto Comtes Religion of Humanity) بن جائے گا۔ مستقبل انسانی روح کی سادگی، بے لوث ایمان اور مثبت کردار کی تلاش میں ہے۔ مستقبل کی روشنی مغرب کے بجائے مشرق کی جانب سے آئے گی۔

یوں اپنے وقت کے تمام رائج نظریوں Positivsim، Utalitarianism، Liberalism اور Materialism کے توڑ پر اس نے زور دے کر کہا کہ فرد کو اپنی ہستی پر جو اصرار ہے، تمام بلاؤں کے سامنے جینے اور اپنا وجود منوانے کی جو دُھن ہے، وہی حُسن و مسرت کی طرف لے جانے والی اور زندگی کے تسلسل کی فیصلہ کن ضمانت ہے۔

مشرق اور مغرب کے عدم توازن، اپنی قوم کی سادہ دلی اور پسماندگی اور انسان کی عالم گیر دردمندی نے مل ملا کر دستوئیفسکی پر بھی فرد کی خودی کے اسرار ٹھیک اسی طرح کھولے جیسے چالیس سال بعد اقبالؔ پر، قصباتی پنجاب سے نکل کر انگلستان اور جرمنی دیکھنے اور برتنے کے بعد کھُلے۔ دونوں نے دل و دماغ کے لیے مغرب سے غذا بھی لی اور اس کی تھالی یہ کہہ کر مُنہ پر بھی مار دی کہ:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہو گا

دستوئیفسکی اور اقبال مغربی یوروپی ملکوں کے بڑھتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کی سیاست اور معیشت میں بداخلاقی اور بے دینی کو بھی "زوالِ مغرب" کی علامتوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اقبالؔ کو چرچ اور اسٹیٹ کے بے تعلق ہونے میں خطرہ نظر آتا ہے:

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

اور دستوئیفسکی کو اسٹیٹ پر رومن چرچ کا اثر ناگوار ہے اُسے پروشیا کا پرنس بسمارک اور ساتھ ہی "کم بخت جرمنی"، گوارا ہے کہ کم از کم وہ کبھی اپنے مُلک میں کیتھولک چرچ کا عمل دخل نہیں ہونے دے گا۔ البتہ دونوں کو اصرار ہے کہ نظامِ حکومت پر دینی اخلاقی قدروں کا سایہ بلکہ گرفت لازم ہے۔

زوالِ مغرب (*Decline of the west*) کے فکر انگیز مصنف اِسپنگلر نے (تالستائی کو نہیں) دستوئیفسکی کو کاشتکار روس کا ترجمان قرار دیا ہے (جلد اوّل II صفحہ 194) تو یہ گنجائش رکھی ہے کہ زرعی نظام کی سمت سے دیکھنے والا روسی ناول نگار قابلِ گرفت نہیں ہے۔ البتہ خود دستوئیفسکی یا اقبالؔ کی زبان سے بار بار مغرب کی روشنی کو تاریکی کا طعنہ ایسا کھسیانا پن معلوم ہوتا ہے جیسے کسی فاقہ زدہ کی زبان سے پیٹ بھرے آدمی کو بدہضمی کا طعنہ۔

زوالِ مغرب کی پیش گوئی میں دستوئیفسکی کا ہم عصر نتشے (بقول اقبالؔ حکیم نِطشا) بھی بلند بانگ ہے اور فرد کے اثباتِ ہستی یا انفرادی خودی کے اصرار پر، زندگی سے بے پناہ عشق کے اعلان میں، تینوں ہم آواز سُنائی دیتے ہیں —— لیکن ایک بڑے فرق کے ساتھ نتشے کو مقصدِ حیات کی دُھن میں، ذریعوں یا طریقوں کے خیر و شر سے کوئی سروکار نہیں، وہ انھیں بھی

سنگین اور بے لگام دیکھنا چاہتا ہے، انسان کی اتھاہ محبت اسے اوّل کلیسائی نظام سے، پھر خدا اور خدا پرستوں سے، یہاں تک کہ خدا ترسی سے اور ترس کے قابل آدمی سے نفرت کی جانب لے جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ان سب کے لیے ہنٹر ہے۔ اقبال کے ہاں شہنشاہیت کے ہر ایک مظہر، غلامی کی ہر ایک علامت اور تقدیر پرست بے عملی کے لیے جو ہنٹر ہے، وہی اس کے راہوارِ خودی کا چابک بن جاتا ہے۔ دستوئیفسکی دکھی آتماؤں کے لیے مسرت کی تلاش میں دائیں بائیں چابک گھماتا نکلتا ہے مگر بعد میں فرد کو خودی پر اصرار کرنے سے روکتا ہے۔ وجود کی پیاس برحق، مگر اپنے اختیار کو، اپنے وجود کو مرکزی حیثیت دینا غلط۔ اُسے تو ایک بامقصد، دین دار انسانی جماعت کے بہاؤ میں، کسی بھی چھوٹی یا بڑی نیکی کی خاطر خود کو بچھا دینا چاہیے "ہمسائے سے محبت کر جیسی خود سے کرتا ہے۔" اس حکم کی تعمیل اگر آنکھوں پر پٹی اور ناک پر رومال رکھ کر کی جا سکے، تو بھی، جتنی بن پڑے، کرنی ہی چاہیے۔ چنان چہ دستوئیفسکی کے ہاں بے زبان، غیر معمولی سہار اور سمائی والے، دُنیا بھر کے طعنوں کا شکار مگر نیک دل کردار ہی ــــ نتاشا اخمینیف ("ذلتوں کے مارے لوگ") سونیا (جُرم و سزا)، میشکن (ایڈیٹ) اور الیوشا (برادران کرامازوف) اُبھر کر آتے ہیں جنھیں بد باطن دُنیا سے انتقام تو کیا، انصاف کا بھی تقاضا نہیں۔ یہی اپنے اور پرائے غم سہنے اور آہ نہ کرنے والے کردار ہیں جو خدا کی رحمت کے امانت دار ہیں اور گُناہگاروں کے دل ان کی جانب کھنچتے ہیں۔

یوں دستوئیفسکی بھی منفی سے مثبت کا طویل فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ نیتشے نے شاہراہ خاص پر فوق البشر (Super man) کی مورتی سجائی تھی۔ دستوئیفسکی نے نیک طینت، خوش ذوق اور خاکسار میشکن اور الیوشا کے مثبت کردار نصب کیے اور اقبال نے "مردِ مومن" کو جلالی (اور جمالی) صفحات کا مثالی مجموعہ کہہ کر پیش کیا، ان تینوں میں، بُنیادی ہم خیالی کے باوجود صرف دستوئیفسکی ہے جس کے ہاں ضبط و انکسار کی اخلاقی صفات (Ethics) بالآخر احساسِ جمال (Aesthetics) سے ہم آغوش اور یکجان ہو جاتی ہیں۔ صداقت اور حُسن ہم معنی ٹھہرتے ہیں۔ دستوئیفسکی زندگی کے حُسن، توازن اور ہم آہنگی کا نقیب بن کر، آدم زاد کو حاکموں کا بار بردار نہیں، بلکہ [آدمیت کی خاطر] بُردبار دیکھنا چاہتا ہے۔ آدمی کو ابھی تک پوری طرح اپنے اختیار سے کام لینا نہیں آیا۔ بے لگام اختیار کا

استعمال عمل کی اندھی طاقت ہے جو دوسروں کے ساتھ خود کو بھی مسرت سے محروم کرلیتی ہے (سمر دیاکوف) مفکر سوچتا ہے، عمل نہیں کرپاتا، مُشتّلک فکر اور عمل کے درمیان مُذبذب ہے (مثلاً ایوآن) اور تذبذب کی چکّی میں پس رہا ہے، لیکن، وہ جسے زندگی سے عشق ہے، جسے بہار کی ہر کونپل پیاری ہے اور جسے ہر ایک کا درد عزیز ہے ــــ وہ مستقبل کی اُمنگ ہے، اور زندگی کے حُسن و ہم آہنگی کا ضامن (الیوشا)۔

نتشے اور اقبال، دونوں سے ہٹ کر دستوئیفسکی دراصل "رموزِ بےخودی" کا پرستار نظر آتا ہے۔ انفرادی اختیار اور خودنگری کا بار کاندھے سے اُتارو۔ اگر مسیح نے اپنی جان بچائی ہوتی تو انسانیت تباہ ہو جاتی، اُسے بچانے کی خاطر اپنی جان دے دی۔ "بھوت پریت" میں اپنے ترجمان کری لوف کی زبانی اس نے انفرادی اختیار کی اہمیت جتانے کے بعد کہلوایا ہے:

"..... اپنی مرضی سے قربانی دینا، شعوری اور بے لوث قربانی، فرد کی قربانی، انسانی بہبودی کی خاطر، میری نظر میں یہی ہے جو شخصیت کا سب سے شریفانہ اور بلند ترین مقام ہے، یہی ہے خود پر مکمل قابو رکھنا (*Self Control*)، یہی ہے اپنے اختیار (*Free will*) کا مطلق اظہار۔ دوسروں کے لیے اپنی زندگی پیش کر دینا، سولی پر ٹنگ جانا، جان پر کھیل جانا، تبھی ممکن ہے جب شخصیت بھرپور ہو، خوب پروان چڑھ چکی ہو ....."

"قومی خدا" ــــ رَدّ و قبول کا حاصل

مُثبت کردار کا خیالی یا حقیقی نمونہ دے کر اس کی جانب بنی آدم کو پکارنا پیمبری فریضہ رہا ہے۔ مُنکر فنکاروں کے لیے بھی یہ عمل پیمبرانہ ہے نتشے کا کلیسا شکن سُپرمَین اقبال کا "مردِ مومن" اور دستوئیفسکی کا "قومی خدا" پر ایمان رکھنے اور اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے والا" موژیک" وہ نمونے یا آئیڈیل ہیں۔ دستوئیفسکی نے بھی بنی آدم کو تین بشارتیں دی ہیں: روس، رلی جن (*Religion*) اور رولیوشن۔ اور اپنی قوم سے خطاب کرکے "خضرِ راہ" کی زبان میں تقریباً وہی بات کہی ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

وہ کہتا ہے کہ روسی موژیک نے سادہ ایمان کی حفاظت کی ہے۔ روسی عوام کی پسماندگی ہے جو انھیں ایک طرف کلیسائی نظام کی عیاریوں سے اور دوسری طرف یورپی تہذیب کے روگ سے بچائے ہوئے ہے۔ عقیدے یا ایمان کو علم کی راہ ناپنا کچھ لازم نہیں۔ عام روسی میں دُکھ جھیلنے، اپنی ضرورت سے بے نیاز ہو جانے اور دوسروں کے غموں میں شریک ہونے، خود کو بچھا دینے کی جو سکت ہے وہی اس میں دینِ مسیحی کے اصل اصول کو سنبھالے ہوئے ہے۔ روسی "موژیک" اپنے ایمان اور لگن کی بدولت خود کو بھی بچالے گا اور ہمیں بھی بچالے جائے گا، کیونکہ روشنی پھر نیچے سے ہی آئے گی۔ مجھے روس پر یقین ہے ..... اسی کی آرتھوڈوکسی (راسخ العقیدہ ہونے) پر میرا ایمان ہے۔ اور ایک پر ایمان لائے بغیر دوسرے کو ماننا ممکن نہیں۔"

(ڈائری" 1877 ")

کڑی سے کڑی جوڑ کر دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ "قومی خدا" کا تصور نہ ہوائی ہے، نہ محض اصطلاحی۔ اس کی پشت پر پسماندہ روس کو سربلند دیکھنے کی تمنا تو تھی، اس کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، مذہب اور فنکارانہ بصیرت کے ردّے اوپر تلے لگے ہوئے ہیں۔

فکر اور وجود، 'سوچنے' اور 'ہونے' کے باہمی رشتے میں وہ جہاں افلاطون کی مابعدالطبیعیات سے متاثر ہے، "خیال" کی اہمیت کا قائل ہے۔ (بلکہ بقائے روح کے تصور میں محی الدین ابنِ عربی کے نظریۂ "اعیانِ ثابتہ" کا سایہ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے) لیکن وسیع معنوں میں یہ "خیال" خود فرد یا جماعت کے وجود سے علاحدہ نہیں، اسی میں رچا بسا ہے۔ اسی کا اصل ستون اور محرک ہے۔

1873 کے "ادیب کا روزنامچہ" (شمارہ دوم) میں اس بحث کا خلاصہ یوں کرتا ہے:

"..... ایسے خیالات ہوتے ہیں جو کبھی زبان پر نہیں آتے، شعوری نہیں ہوتے، صرف شدّت کے ساتھ محسوس کیے جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے خیالات، یوں سمجھیے کہ، آدمی کی روح میں رچ بس جاتے ہیں۔ ایک آدمی نہیں، بلکہ پوری ایک جاتی، پوری قوم اور پوری نسلِ آدم میں بھی سرایت کیے ہوتے ہیں۔ جب تک یہ خیالات کسی جاتی (یا قوم) کی زندگی میں لاشعوری طور پر بسے ہوتے ہوں اور (ان کا اثر) اچھی طرح، شدت کے ساتھ محسوس کیا جائے، تبھی تک وہ جاتی یا قوم بھرپور اور

زبردست زندگی جیتی ہے۔ اس کی زندگی کی تمام تر قوت اسی تمنا اور تقاضا میں لگ جاتی ہے کہ وہ در پردہ خیالات کسی رُوپ میں اُبھر کر اس کے سامنے آئیں ....."

انسان کو ہستی کے اثبات اور عالمِ فطرت پر بڑھتے ہوئے اثر و اختیار کا شعور اوّل اوّل کس نے دیا تھا؟ مغربی تمدن نے۔ اور اب یوروپ میں قدرتی سائنسوں، سائنسی دریافتوں کی لائی ہوئی صنعتی، کاروباری اور سرکاری ہماہمی نے فرد سے وہ شعور چھیننا اور اسے مشینی پُرزہ بنانا شروع کر دیا ہے تو "روسی یوروپین" کیا کرے؟ یہی کہ انسانی آزادی اور اختیار کی ٹوٹی ہوئی ڈور کو "نئے خیال" کی گانٹھ دے کر پھر جوڑے اور اسے "زمین" کی سُرنگ میں ڈال دے۔ "قومی خدا" کے تصوّر نے یہیں جڑ پکڑی ہے۔ اور زمین صاف کرنے کی کوشش میں اس نے صدیوں پُرانے اس خیال کا حل چلا دیا کہ :

"مادی طاقتیں، یوں دیکھنے میں، کتنی ہی ہیبت ناک اور اٹل نظر آتی ہوں، مگر بالآخر انھیں، یا مال و دولت، یا تلوار (اسلحہ کی قوت) کو، (سیاسی) اقتدار کو فتح نصیب نہیں ہونے والی۔ بلکہ کسی ایسے خیال کی قسمت میں ہے فتح مندی جو اوّل اوّل نظر میں بھی نہ آئے۔ لیکن اسے طاقت یا پُشت پناہی میسّر ہو بظاہر سب سے بے حیثیت انسانوں کی۔"

(ادیب کا روزنامچہ 1876ء حصّہ اوّل)

اثباتِ ہستی کی فطری تمنا پر زور دینے اور بقائے روح پر ایمان رکھنے والا، ہمارا مصنّف قوت کے ان دونوں سرچشموں کو فرد کے ہاتھ سے لے کر قوم کے حوالے کر دیتا ہے۔ بظاہر "سب سے بے حیثیت انسانوں"، "سادہ دل بندوں" کی قومی جماعت کو وہ اس امانت کا اہل شمار کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال "رموزِ بے خودی" میں پہنچے (17 - 1916)۔

روس میں دہریوں، بے دین اور بے خدا جینے والوں کی تعداد دُنیا کے تمام مُلکوں سے زیادہ ہے ـــــ اس بیان کو تسلیم کر لینے کے ساتھ دستوئیفسکی اپنے مثبت (اور عملی زندگی میں ناکام) ہیرو میشکن کی زبانی کہہ چکا ہے کہ جس شخص کے پاؤں تلے وطن کی مٹی نہ ہو اس کا کوئی خدا نہیں ہوتا..... ذرا روس کی بیکل آتما کو "نئے خیال" کا دفینہ تو کھول کر دکھاؤ، اسے رُوسی خیال کا شعلۂ [طُور] تو دیکھنے دو، اسے روسی خدا اور مسیح کے

عقیدے کے ساتھ اُٹھنے تو دو، تب دیکھنا، کیا زبردست سچّا، کھرا، دانا اور شریف جن حیرت زدہ دُنیا کے سامنے اُبھر کر آتا ہے۔ دُنیا حیرت اور خوف سے لرز جائے گی، کیوں کہ اسے اگر ہم سے اندیشہ ہے تو صرف تلوار اور تشدّد کا؛ وہ لوگ ہمیں بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور درندگی کے بغیر ہمارا تصوّر کر ہی نہیں سکتے.....''

ناول ''بھوت پریت'' میں، ''ایڈیٹ'' اور ''سدا سہاگی'' میں اس خیال کو بڑھاتے اور ''ادیب کا روزنامچہ'' میں اس کی تشریح اور تائید کرتے کرتے وہ اپنے آخری ناول ''برادران کرامازوف'' میں رومن چرچ کے زمانہ ساز، خانہ ساز عالم گیر مسیح اور مسیحیّت کے تصوّر پر پوری بے دردی سے حملہ کرتا ہے۔ یوں نہیں کہ ''پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو'' بلکہ یوں کہ ''میرے لیے مٹّی کا حرم اَور بنا دو''۔

استدلال کی لائن یہ بنتی ہے: مسیح کا تصوّر مکمّل ہم آہنگی اور مکمّل حُسن، بے لوث محبت اور اپنے پرائے دُکھوں کی اتھاہ برداشت کی ایک علامت ہے۔ یہ صفات کسی فرد میں بھی ہو سکتی ہیں اور کسی (نسلی، لسانی، مذہبی یا جغرافیائی) جماعت میں بھی۔ سیدھے سچّے عقائد کو بدلتے ہوئے زمانے اور اربابِ اقتدار کی مصلحتوں کے مطابق ڈھالتے رہنے سے رومن کیتھولک کلیسا نے انھیں پیچیدہ اور 'دُنیا دار' بنا دیا۔ الگ الگ (یوروپی) قومیں یا تو اس میں جذب ہو گئیں یا اس سے مُنھ پھیر کر مادّیت پرست ہوتی چلی گئیں۔ صرف ایک روس بچا ہے اپنے آرتھوڈوکس (پراوو سلافنی) چرچ کے ساتھ، جس پر نہ ابھی مغربی مادّیت پرستی کے فلسفے غالب آئے ہیں، نہ رومن کلیسا۔ حالاں کہ یہاں مسیحی آئیڈیل کے بہترین نمونے اور قوت و عظمت کے تمام آثار موجود ہیں۔ قومیں اُٹھتی ہیں نئے ''خیال'' (مصنّف کی زبان میں ''آئیڈیا'') کے ساتھ اور اس یقین کے ساتھ کہ حقّانیت تنہا ہمارے پاس ہے جو ہم باقی دُنیا میں پھیلائیں گے۔ دُنیا میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ سبھوں کا، یا کئی ایک قوموں کا ایک مشترک خدا رہا ہو..... مشترک خدا ہونے لگے تو یہ اس قوم یا ان قوموں کے زوال کی علامت ہے..... جب کئی کئی قوموں کا ایک ہی خدا ہونے لگتا ہے تو خدا اور ایمان دونوں پر زوال آتا ہے۔ اسی کے ساتھ قوموں پر بھی۔ کوئی قوم

جتنی جاندار ہوگی اس کا خدا بھی اتنا انفرادی ہوگا۔ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کا اپنا مذہب نہ رہا ہو، یعنی وہ خیر و شر کے تصور سے خالی رہی ہو۔ ہر قوم کے پاس خیر و شر کا اپنا تصور اور اپنا خیر و شر ہوتا ہے۔ جب یہ تصور کئی قوموں میں ایک سار سرایت کر چکتا ہے تو وہ قومیں مرنے لگتی ہیں اور خیر و شر کا امتیاز بھی ان سے اُٹھنے لگتا ہے .....

("بھوت پریت" کے ایک مکالمے سے)

دستوئیفسکی خاص معنوں میں **قومی عصبیت کی اہمیت** جتاتا ہے۔ جب تک انسانوں کے کسی گروہ میں ایک خاص عصبیت (Bias) ذہن نشین نہ ہو جائے وہ انھیں جوڑنے، صف بند کرنے اور حرکت میں لانے والی قوت نہ بن جائے، تب تک وہ قوم، وہ گروہ یا فرقہ تاریخِ عالم میں اپنا رہنمایانہ رول ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہاں پھر دستوئیفسکی، نتشے اور اقبال ہم زبان ہو جاتے ہیں۔ (ابنِ خلدون کے صدیوں بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ علمی روشن خیالی نے عصبیت کو اس کے متوازن ڈوائی منش میں پہچانا اور پہنچوایا) روس یوروپی رنگ میں پوری طرح نہیں رنگا جا سکا تو یہ اس کے لیے خیر و برکت ہے۔ یوروپ خدا سے، اپنے اور عام کلیسا کے خدا سے محروم ہو چکا ہے۔ فرانس میں انقلابیوں کی لہر اور جنتِ ارضی کے دعوے بالآخر کیتھولزم اور سوشلزم کو ایک دوسرے کا حلیف یا رفیق بنا دیں گے۔ وہاں مستقبل سوشلزم کا ہے اور کلیسائی نظام، حسبِ عادت، خود کو طاقت کے آغوش میں ڈال دے گا۔ صرف روس ایسا مُلک اور روسی وہ شہری ہے جو انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوتے باقی بنی آدم کا درد لے کر اُٹھ سکتا ہے اور ان کی خاطر زمانے کے ستم سہہ سکتا ہے۔ مسیحی مِشن کی امانت اب روسیوں کے شانے پر آنے والی ہے کیوں کہ "سچے روسی کی نظر میں مہان آریائی قبیلے (نسل) کی آماجگاہ کی حیثیت سے یوروپ اتنا ہی بیش قیمت ہے جتنا خود روس" ایک بار روسی اگر اپنے "قومی خدا" کو، خیر و شر کے قومی انفرادی تصور کو سینے سے لگا کر اُٹھ جائیں تو محبت کے، ترغیب و ترکیب کے طریقے سے، ورنہ بزور بازو دُنیا کا نقشہ بدل

دیں گے اور وہ وقت دُور نہیں ہے۔"

یہ خیالات آخر کے ناولوں میں ہی نہیں، مضمونوں اور حالاتِ حاضرہ کے تبصروں میں بھی اسی زور کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ پڑھنے والا بعض اوقات بھول جاتا ہے کہ "روزنامچہ" میں تبصرہ پڑھ رہا ہے، یا کسی کردار کا مکالمہ سُن رہا ہے۔

خیالات، اس کے ہاں، جذبہ بن گئے ہیں اور جذباتی منظر میں گھرے خیالات، اثبات و انکار، تائید اور رَد کی صورت میں چھپے ہوتے ہیں۔ دُنیا کے ادب میں فلسفیانہ ناول کا باوا آدم دستوئیفسکی، فلسفیانہ یا نفسیاتی بحثوں کو ناول کا مقصد نہیں، اس کے ریڑھ کی ہڈی بنا دیتا ہے، اور خیالات، یوں محسوس ہوتا ہے کہ، زندہ لوگ، زندگی سے تپتے ہوئے لوگ اپنے پورے وجود سے ادا کر رہے ہیں۔ ناول نگار کی پوری زندگی کو اس کے ادبی کارناموں کے ساتھ کامیابی سے جوڑ کر دیکھنے والا مصنف ارنسٹ سمنس (E.J. Simmons) اپنی ضخیم تصنیف کو ان جملوں پر تمام کرتا ہے:

"ذاتی زندگی میں بھی وہ اپنے اصلی احساسات، جذبات اور وَلولوں کے اظہار سے نہیں جھجھکتا تھا۔ نہ اس نے اپنے تخیل کی اولاد کو ان گہری انسانی صفات سے محروم رکھا۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ اگر کبھی خوش رہتا ہے تو انہی طویل راتوں میں، جب اپنے تخیل سے تراشے ہوئے اُن مردوں عورتوں کی صحبت میں اسی طرح بیٹھتا ہے جیسے سچ مچ کے انسانوں کے ساتھ۔ وہ ان سے پیار کرتا ہے، ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی مصیبت میں آنسو بھی بہاتا جاتا ہے۔ جذبے (Feeling) کا یہی مطلب ہے ....؛

..... جذبے کی یہی صفت، جو خود زندگی کی جلوہ نمائی میں پہچانی جاتی ہے، غالباً سب سے زیادہ یہی ایک صفت اس گہرے اور اثر انگیز تجربے کی جان ہے جس تجربے کا، ہمیں اس کے ناول پڑھتے وقت لطف آتا ہے۔"

پیش گوئی، سیدھی اور ترچھی

کچھ ضرور نہیں کہ ہم دستوئیفسکی کی تصانیف کا لطف اُٹھاتے وقت اس کے خیالات، تجزیوں، نظریوں اور پیش گوئیوں سے بھی اتفاق کریں۔ کسی عظیم فنکار یا فن پارے کی اثر انگیزی

کئی سمتوں سے ہوتی ہے۔ پہلو دار شخصیت اور تہ دار نظر رکھنے والا، کسی نہ کسی سمت کو رد کر کے باقی کو قبول، بلکہ اپنے شعور میں جذب کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔

پھر خیالات ہیں کہ ان کا شجرۂ نسب دُور تک پھیلا چلا گیا ہے۔ ہونے اور سوچنے کے باہمی رشتے کو استاد افلاطون اور شاگرد ارسطو نے دو مختلف نتیجوں پر چھوڑا تھا۔ کارل مارکس نے انسانی آزادی کی ہزاروں سال پرانی جدوجہد کی کرید میں جدلیات (Dialectics) کے طریق کار سے جائزہ لیا تو "ہونے" کو "سوچنے" پر مقدم ٹھیرایا۔ اسی کے معاصر فن کار دستوئیفسکی نے بھی جدلیات کا عمل کیا۔ "ہونے" کی اہمیت مانی اور جتائی، لیکن آگے چل کر، خیال کو، شعور کو، یعنی سوچ کو فیصلہ کُن قرار دیا اور یہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ اپنے ساری باریک بینی کے باوجود وہ عمر بھر تجزیے کے متضاد نتیجوں میں اُلجھا رہا: برادرانِ کراما زوف" میں پھر سوچنے والے پر ہونے والا کردار حاوی نظر آتا ہے ——— وہ جسے سوچ عزیز تو ہے، مگر اتنی نہیں کہ زندگی کے خیر و شر اور بہار و خزاں سے خود کو بے نیاز کرے۔

یہی معاملہ مسیحی تصوف (Mysticism) کی طرف اس کے رجحان کا ہے۔ اُداس بچپن کے اس مصنف کو بچے بہت عزیز تھے۔ ہر ایک ناول میں کہیں نہ کہیں کوئی بچہ مچل رہا ہے۔ اس کرب کے ساتھ کہ تھوڑی دیر کو ہم باقی کہانی بھول کر اسی میں ڈوب جاتے ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو کالے کاغذوں کو بھی اپنے آنسوؤں میں ڈبو دیتے ہیں۔ دُنیا کے ضابطے، گھریلو حالات کے شکنجے اور ماحول کے جوڑ توڑ ان معصوم پرندوں سے آزادی اور معصومیت کیسے چھین لیتے ہیں! اور پھر بچپن کی موت ——— آخر اس المنا کی کا کیا توڑ ہے؟ کیا جواب ہے؟ بچوں کی اذیت اور بچپن کی موت پر اس کے کردار کبھی کبھی تو دہریت کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ قدامت پسند مسیحیت دِلاسا دیتی ہے، جواب نہیں دیتی؛ تجدیدی مسیحیت اسے مشیتِ خداوندی کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مسیحی تصوف سہلاتا ہے، قائل نہیں کرتا اور سوال بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ آخر حیاتِ تازہ (Resurrection) کے تصور میں، جو تالستائی اور دستوئیفسکی کے ہاں مشترک ہے، اسے پناہ ملتی ہے۔ تاہم دانش، وجدان "خیال" اور ایمان نے بچوں کے مصائب اور مسائل پر اپنے اپنے طور پر جو کچھ سُجھایا، دستوئیفسکی اسے مختلف کرداروں کے رُوپ میں دکھاتا رہا۔ ہم اس کے عقیدے میں شریک ہوئے بغیر بھی ان مناظر سے اپنے شعور کو صیقل کر سکتے ہیں۔

دستوئیفسکی نے کئی قماش کے کرداروں کو مرگی کا مریض دکھایا ہے۔ بدظن اور بدزبان ماحول کے طنز کا نشانہ فرشتہ سیرت میشکن مرگی کا مریض، "رنج و راحت کو ہموار کرکے"، ہر حال میں مگن اور بامعنی زندگی جینے والا کری آوف مرگی کا روگی، بے تحاشا اور بے محابا عمل کا بندہ سمردیاکوف مرگی کا مارا۔ اور خود مصنف، ان خیالی پُتلیوں کا تماشا دکھانے والا اور اپنے لیے پیمبرانہ رول کا یقین رکھنے والا مصنف اسی کہنہ مرض میں مبتلا۔

جدید سائنسی اور طبی تحقیق نے تو مرگی کو اعصابی ہیجان کہہ کر، اس کا توڑ تجویز کرکے، دستوئیفسکی کا بیشتر خیال رد کر دیا، مگر کیا ہم دستوئیفسکی کی تشریح پر ایمان لائیں تبھی اس کے کرداروں کے باطن سے مل سکتے ہیں؟ تبھی اس کے ذہنی اور فنی کارنامے ہمارے لیے بامعنی ہو سکتے ہیں؟ جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہوگا، کیوں کہ اس کے پاس اپنے پسندیدہ الفاظ، انداز اور استعاروں میں بہت کچھ وہ ہے جو آج بھی ہمیں چونکانے یا بصیرت بخشنے میں بے آب نہیں ہوا۔

ایشیا، اے ایشیا!

جس نئے خیال کو دستوئیفسکی اپنی قوم کی سست رگوں میں ڈالنے اور بجلی دوڑانے کے لیے بے تاب ہے، جس عالم گیر ردّ و بدل کی وہ بار بار بشارت دے رہا ہے —— وہ خیال پُراسرار تاریخِ عالم نے جوں کا توں اپنے کشکول میں نہیں ڈالا۔ لیکن ہاں، چھلکا اُتار کر مغز چکھیے تو جو ذائقہ اس کی روح نے لیا ہوگا، کچھ ویسا ہی ہمیں بھی ملے گا۔

روس کی آتما "نیا خیال"، عالمی سطح پر رہنمائی کی بے تابی اور سکت، "موژیک"، روسی کسان، مزدور، سپاہی، محنت کش —— اور وہ دانش ور، جس کے پاؤں کیچڑ پانی میں لت پت ہوں، ان لفظوں کے معانی، جن کی دُھن آخری دس سال دستوئیفسکی پر سوار رہی، ہم پر آج کھل چکے ہیں۔

دوسری ایک اور دبی سی تمنّا تھی جو وقت کے ساتھ ہلکے گہرے رنگ بدلتی رہی؛ مشرق کی طرف، ایشیا کی جانب جُھکنے کی۔ آخری خانہ آبادی سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اگر قدم اکھڑے تو میں یروشلم (فلسطین) جاکر پڑ رہوں گا۔ پھر جب بلقان کی سلاف قوموں نے تُرکی عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت کا پرچم اُٹھایا تو دستوئیفسکی نے اپنی قوم کو للکارا کہ یہی وقت ہے کہ

ہم قسطنطنیہ میں، (جو ہمارا روحانی وطن ہے (قبلۂ اوّل ہے)۔ اس مرکز پر فوجی تہذیبی چھاؤنی ڈال دیں، فتح کر کے اسے اپنالیں۔ روس پر فرض ہے کہ ہتھیار اُٹھائے اور تمام سلاف قوموں کو آزاد کرانے کے لیے میدان میں اُتر آئے۔

(جملۂ معترضہ: یہ وہی جذبہ ہے جس نے پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد، تقریباً ویسے ہی حالات میں اقبالؔ سے کہلوایا تھا ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر)

دستوئیفسکی یوروپ سے نظر بچاکر، قسطنطنیہ اور یروشلم کو ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یوروپ کو بار بار جتاتا ہے کہ ہمارا مشرق کی طرف سرکنا نہ صرف ایشیا کے حق میں مفید ہوگا بلکہ یوروپ کے نقشے میں بھی مفید تبدیلیاں لائے گا۔ تُرکی میں جب روسی فوجیں بڑھنے لگیں اور قسطنطنیہ کی فصیل تلے پہنچ گئیں تو دستوئیفسکی نے سجدۂ شُکر ادا کیا اور کہا کہ ہماری فتوحات کی خبریں دبے کچلے ہندوستان تک پھیلنی چاہییں تاکہ وہ مُلک بھی ہمیں اُمیدگاہ سمجھے۔

مسیحی تصوّف کی جس خاص لائن کو اپنانے اور ہنسا (تشدّد) کو نفرت سے دیکھنے میں وہ [تالستائی سے برسوں پہلے] بُدھ مت کے اہنساتمک دھرم تک آپہنچا، جس مسیحیت کو وہ سیدھا سچّا دین سمجھتا اور کہتا تھا، اس کا شجرہ ایشیائی زمینوں میں نظر آنے لگا۔ روز بروز اس کی نظرِ التفات ایشیا کی طرف ہوتی گئی یہاں تک کہ آخری بار، آنکھ بند کرنے سے پہلے، جب اُسے ترکمانیہ کی طول طویل جنگ میں روسی لشکر کی مکمّل فتح کی خبر ملی تو اس نے اپنی پوری قوم [فرقہ وارانہ] عصبیت اور سیاسی شعور کو یکجا کر کے ایک یادگار نوٹ لکھوایا جو "ادیب کا روزنامچہ" کے آخری شمارے میں شائع ہوا ہے۔ خلاصہ کچھ یوں ہوگا:

"..... بہت سے لوگ ایشیا میں ہماری فوجی مہم اور جارحانہ پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں کہ ہم وہاں خواہ مخواہ روپیہ اور آدمی ضائع کر رہے ہیں۔ آج تک ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایشیا میں ہمارا مشن کیا ہے۔ اب اور آئندہ ایشیا کی، ہمارے لیے کیا اہمیت ہوگی..... شکست" اچھا ہے کہ گورے زار اور اس کی تلوار کے ناقابلِ شکست ہونے کا یقین کروڑوں مخلوق تک پہنچے، ہندوستان کی سرحدوں تک بلکہ اس مُلک کے اندر بھی"..... خان اور امیر ہوتے ہیں تو ہوا کریں، انگلینڈ کی بڑی ساکھ ہے، رہا کرے، لیکن گورے زار کا جھنڈا ان

خانوں، امیروں، بلکہ خود خلیفہ کے نشان سے بلند ہونا چاہیے، یہ بات ایشیا میں پھیلتی چلی جائے۔ یہ ضروری ہے کیوں کہ یہی انھیں (ایشیائیوں کو) مستقبل کے لیے تیار کرے گی۔

مستقبل سے کیا مطلب؟ آئندہ ایشیا پر عمل دخل قائم کرنے کی ہمیں کیا ضرورت؟

"ضرورت ہے، کیوں کہ روس، صرف یوروپ میں نہیں، ایشیا میں بھی ہے۔ روسی صرف یوروپی نہیں، ایشیائی بھی ہے۔ مزید یہ کہ یہ یوروپ سے کہیں زیادہ ہمارے لیے ایشیا میں امیدیں ہیں اور مستقبل جو مقدر ہوا ہے، اس میں ایشیا غالباً ہمارے لیے بڑی سبیل بنے گا"

"..... ہمیں یہ غلامانہ خوف دلوں سے نکال دینا چاہیے کہ یوروپ ہمیں ایشیائی وحشی کہے گا اور طعنہ دے گا کہ ہم یوروپی سے زیادہ ایشیائی ہیں۔ کوئی دو صدی سے یہ خوف ہم پر سوار رہا ہے۔ آج کل 19 ویں صدی میں تو یہ کابوس بن گیا ہے" اس اندیشے کے مارے ہم نے اپنی روحانی (ذہنی) آزادی بھی کھوئی، یوروپ میں پالیسی بھی ناکام رہی اور نہ جانے کتنا دھن لٹا چکے ہیں یوروپ والوں پر یہ ثابت کرنے کے لیے ہم یوروپی ہیں، ایشیائی نہیں"

14 - 1812 میں نپولین بوناپارٹ کی فتح و شکست میں روس کے رول کا جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے:

"پھر بھی یوروپین قومیں ہمارا اعتبار نہیں کرتیں۔ ہمیں اجنبی سمجھتی ہیں۔ وہ لوگ ہمیں چور اُچکے شمار کرتے ہیں کہ ان کی بلند صفات چرالیں اور انھی کے لباس کا بہروپ بھر لیا۔ ترک اور سامی (عرب اور یہودی) تک اُنھیں ہم آریاؤں کے مقابلے میں زیادہ قریبی لگتے ہیں۔ وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ ہمارے پاس عالمِ انسانیت کو دینے کے لیے ان سے بالکل ہی مختلف خیال موجود ہے"...

ابھی تک یوروپ کو خبر نہیں کہ روس اس قابل ہے کہ دُنیا کو نیا خیال دے سکے، لیکن ایک دن، یوروپ کی تقدیر کا ایک نازک لمحہ ایسا آئے گا جب اس پر روس کا نیا خیال ضرور کھُل جائے گا۔ یوروپ ہم سے بیزار ہے۔ بہت ہوا تو تمیز داری کے مارے اتنا مان لیتا ہے کہ ہاں، روس میں بھی سائنسی کام کرنے والے اُبھر رہے ہیں۔ علوم کو روس سے بھی کچھ فیض پہنچ رہا ہے، مگر اس کے گلے یہ بات نہیں اُترتی کہ محض سائنسی کارکن نہیں بلکہ بڑے جینیس اور نسلِ آدم کے، بیکن، کانٹ اور ارسطو جیسے رہنما روس میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک حد تک درست بھی ہے، بیکن اور نیوٹن جیسی ہستیاں تب تک نہیں اُبھریں گی جب تک کہ ہم اپنی راہ پر قدم رکھنے اور روحانی طور پر آزاد ہونے سے محروم ہیں۔ سائنس کے علاوہ یہی بات آرٹ اور انڈسٹری پر بھی

صادق آتی ہے۔ یورپ یوں تو ہمیں تھپکنے اور سر سہلانے کو تیار ہے لیکن جب ہم اس کی گردن میں لٹکنے کے لیے لپکتے ہیں تو وہ ہم سے خفیہ اور علانیہ تنگ آجاتا ہے۔۔۔۔۔

یورپ کی کھڑکی ہم کھلی رکھیں، لیکن میں پھر زور دے کر کہتا ہوں کہ آئندہ بہاؤ کی راہ ہمیں ایشیا میں ہی ملنے والی ہے۔ اپنے انھی خیالات پر سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے:

یقیناً ہم یورپ سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ یورپ بھی، روس کی طرح ہماری ماں ہے، دوسری ماں۔ ہم نے اس سے بہت کچھ پایا، اور بھی پائیں گے۔ ہم احسان فراموش نہیں بننا چاہتے۔۔۔۔۔

یورپ میں ہم حاشیہ نشین اور غلام شمار ہوتے رہے، ایشیا میں ہم آقاؤں کی طرح جائیں گے۔ یورپ میں ہم ایشیائی تھے، مگر ایشیا میں ہم بھی یوروپی شمار ہوتے ہیں۔ ایشیا میں ہمارا تمدنی مشن ہمیں نئی توانائی عطا کرے گا اور آگے بڑھائے گا۔ ہمیں اب حرکت میں آجانا چاہیے۔ صرف دو ریلوے لائنیں کھول دیجیے، ایک سائبیریا کی طرف، دوسری وسط ایشیا کو۔ پھر نتیجہ آپ خود دیکھ لیں گے۔۔۔۔۔ (جنوری 1881ء)

دستوئیفسکی خود نتیجہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہا۔ البتہ ایشیا نے پچاس برس گزرنے سے پہلے ہی دیکھ لیا۔ پیغمبری چاہے کسی قبیلے کی ہو یا دو جہان کی، عارضی ہو یا مستقل، اسے اپنی جنم بھوئی کو سربلند دیکھنے کی تمنا ضرور ستاتی ہے۔ مگر جیسا کہ تاریخ گواہی دے چکی ——— اور خود دستوئیفسکی نے خواب اور تعبیر میں جو ترجمی، بظاہر بے ربط لکیروں کا رشتہ نکالا۔ اس سے ثابت ہے کہ خواب کی اصل تصویر اور اس کی تعبیر میں مشابہت کے پس پردہ کوئی دُور کا واسطہ ضرور ہوتا ہے۔ تعبیر جُوں کی توں خواب کا لفظی ترجمہ نہیں ہوا کرتی۔ دستوئیفسکی کی پیش گوئی کو بھی، روس کے، یورپ اور ایشیا کے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ دُکھی بکھرے ہوئے، ستم زدہ، تنہا آدمی کے حالات میں وہی دخل ہے جو خواب کو اس کی سچّی تعبیر میں۔

وہ جرنلسٹ تھا، تنقید نگار، تبصرہ نگار، طنز نگار اور ناول نگار تھا، نفسیاتی اور فلسفیانہ مکالموں کا موجد تھا، اخلاقی اصولوں کا پرچارک تھا۔ تالستائی، تورگینیف اور دستوئیفسکی نے اپنے بہترین ناول، بلکہ عالمی ادب کے تین اہم نمونے ایک ہی وقت میں لکھے۔ تب دُنیا کے اہم اہلِ قلم ستنثے، براؤننگ، ولیم بلیک اور بالزاک مغربی یورپ پر چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت "برادران کرامازوف" جیسا مختشک اور ضخیم ناول نکلا اور چند سال بعد، جب نہ گوارا زار تھا،

نہ زار شاہی، نہ دستوئیفسکی کو سرکار کی سرپرستی حاصل رہی تھی، نہ پُرجوش انقلابیوں کی ہمدردی — وہ اپنے خوابوں کی تعبیر بن گیا اور زمان و مکاں کی حدیں پھاند گیا۔ اس کے ناول اپنے تمام مُلکی اور غیر مُلکی معاصرین سے زیادہ عالمی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ A. Steinberg نے ختمِ تحریر یہ دعوا کیا ہے

جہاں تک (خالص) ادبی فن کا تعلق ہے، عالمی ادب کا طالب علم حق بجانب ہوگا اگر وہ [دُنیا بھر کے ادب کو] دستوئیفسکی سے پہلے کے اور بعد کے دو دَور میں تقسیم کر دے . . . . . (صفحہ 117)

دُنیا سے گُزر جانے کے بعد

دستوئیفسکی کے دیے ہوئے خیالی پیکر ہمیں پسند ہوں یا ناپسند، بہرحال نہ وہ کٹھ پُتلیاں ہیں، نہ موم کے پُتلے —— کیوں کہ ان میں غضب کی شِدّت ہوتی ہے۔ تراشنے والا اُن میں اپنے لہو کی گردش اور سینے کی آگ کچھ اس طرح بانٹ دیتا ہے کہ وہ خود پگھل کر گُم نہیں ہوتے، ہمیں پگھلا دیتے ہیں۔ صفِ اوّل سے زیادہ صفِ دوم کے، بظاہر معمولی (مگر" ابنارمل") کرداروں میں یہ شِدّت اور بھی بڑھی ہوتی ہے اور وہی اس کے خیالات کی ترجمانی خوب کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک خاصیت تھی جس نے دستوئیفسکی کا سایہ اس کے قد سے لمبا کر دیا۔ روسی زبان نے عالمی ادب کو ایک ہی وقت میں تین بڑے ناول دیے (70 - 1867) تورگینیف کا "باپ بیٹے"، تالستائی کا "جنگ اور امن" اور دستوئیفسکی کا "جُرم و سزا"؛ ایک نے سماجی کشمکش کے تانے بانے دکھائے، دوسرے نے تاریخی باب کے لہو ترنگ ورق پھیلائے، مگر دستوئیفسکی نے فرد کا باطن، جُرم کی نفسیات، جبر و اختیار کی رسّہ کشی میں "مجھے سب کچھ جائز ہے" کا انجام دانائی اور دیوانگی کا متوازی عمل اور پھر نئی زندگی تک پہنچنے کا حوصلہ سب کھونددڈالا، سب کا رَس یکجان کر دیا۔ بعضوں کی نظر میں یہ ناول ایکشن اور اندرونی ہلچل کے تلازمے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

تورگینیف کو اس نے ایسا درخت قرار دیا تھا جس کی قلم باہر کی (جرمنی کی) جڑوں پر لگی ہے جو روس کو حقیر، دہقانی اور بے عزّت سمجھتا ہے ("بھوت پریت" میں کرمازینوف نام کا کردار اسی کا خاکہ ہے)۔ تالستائی کو وہ امیروں اور اشراف کا داستاں گو سمجھتا تھا۔ تورگینیف نے پوشکن والے آخری یادگار اجلاس میں اسے سینے سے لگایا، تالستائی نے اس کی موت پر آنسو

بہائے۔ "مُردوں کے گھر کی یادداشتوں" کو تورگینف نے دانتے کے لازوال شاہکار" دوزخ" کے برابر تولا، اور ہرزن (Gertsen) نے اسے مائیکل آنجلو کے شاہکار" روزِ قیامت" کا ہم پلّہ قرار دیا۔ سی۔ ایم۔ وُوڈ ہاؤس (C. M. Wood House) نے تینوں کا موازنہ کرتے ہوئے تالستائی کو روسی ناول کی بلند ترین چوٹی، تورگینف کو خوش منظر سبز ڈھلان اور دستوئیفسکی کو بلند سلسلۂ کوہ سے تشبیہ دی ہے جو بے پناہ اور ہیبت ناک بھی ہے اور ناقابلِ تسخیر بھی۔

دستوئیفسکی کی ابتدا بغاوت سے، انکار سے ہوئی تھی، بغاوت کی چنگاری شک بن کر اس کے وجود میں سُلگتی ضرور رہی، تاہم انتہا، عقیدے اور یقین پر ہوئی۔ فادر زوسیما کی زبانی اس نے کہلوایا ہے کہ خدا کی تمام مخلوق سے، ریت کے ہر ذرّے سے محبت کرو۔ جب تم میں محبت ہی محبت رہ جائے گی تو چیزوں کے غیبی اسرار کُھلنے لگیں گے۔ عالمگیر انسانی محبت کی لہروں میں بہتے وقت اس پر مستقبل کے اسرار کُھلنے لگے تھے، اور لب بند ہونے کے بعد اسے بھی جواب میں اہلِ وطن کے بہ نسبت غیر مُلکی اہلِ قلم سے وہ محبت اور عقیدت نصیب ہوئی جو تب تک کسی روسی مصنّف کو نہیں ملی تھی۔

جرمنی میں تو اس کی دھوم مچ گئی۔ یاد نہیں، کس جرمن مصنّف نے یہاں تک دعوا کر دیا کہ لوتھر کے بعد (یعنی تین سو سال میں) جرمن ذہنوں پر دستوئیفسکی سے زیادہ کسی نے اثر نہیں ڈالا۔ اسٹیفان زوائگ (S. Zweig) نے اسے فرانسیسی بالزاک، انگریز ڈکنس کی صف کا تیسرا باکمال شمار کیا ہے۔ نیتشے صرف اسی کو اپنا اُستاد قرار دیتا ہے اور کاؤس (Kaus) نے فرینچ ناولسٹ فلابیر کے برابر گنا ہے۔ فرائڈ کے بعد اس کے مدِمقابل ایڈلر نے 1918ء میں یہاں تک کہہ دیا کہ نفسیات کی سائنس کو دستوئیفسکی کی دین اتنی ہے کہ ابھی تک سمیٹی نہیں جا سکی۔

اسے فرانسیسیوں سے خود پسندی کی شکایت تھی، مگر بڑے بڑے فرانسیسی دانش ور نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ آرنلڈ بینٹ (A. Bennet) نے بتایا کہ آندرے ژید (A. Gide) اور میں، دونوں متفق ہیں کہ "برادرانِ کرامازوف" سے بڑا ناول آج تک دنیا میں لکھا نہیں گیا۔ ژید نے دستوئیفسکی کو خاص طور سے اپنا موضوع بنایا اور ادب سے سر جھکا دیا۔ ژاں پول سارتر (G.P. Sartre) اسے وجودیت کے فلسفے (Existentialism) کا نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے۔ آندرے مالرو (A. Malraux) اور ماریک (Mauriac) سارتر اور البیر کامو (A. Camo)

سبھی نے اپنی تصانیف پر اس کا اثر قبول کیا ہے۔

وسطی یوروپ میں، اگرچہ ترجمے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے، لیکن دستوئیفسکی ایک فنی، ادبی اور فکری فیشن بنا۔ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد، آسٹریا کے کافکا اور زواگ نے اس کے اثرات کا اقرار کیا ہی تھا کہ اظہاری (Expressionist) شاعروں نے اسے عالمگیر اخوت کے پیغمبر کی حیثیت سے اپنا لیا۔ میکس اَرنسٹ (M. Ernest) مصور نے اپنا ایک پورٹریٹ تیار کیا جس میں وہ دستوئیفسکی کی آغوشِ محبت میں بیٹھا ہے۔ وقت کے بڑے بڑے فنکاروں نے، آسکر وائلڈ، تھامس اور تھری مان (Th. Mann) نے اسے مانا۔ امریکہ میں ڈرائزر (Dreiser) اور اینڈرسن نے، فاکنر (Faulkner) نے اس کے اثرات قبول کیے اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد تو دستوئیفسکی کے ترجموں اور تفسیروں کی ایک رَو چل پڑی۔ رینے ویلک (R. Wellek) نے مجموعۂ مضامین کے دیباچے میں تفصیل دی ہے۔

پھر ترجیحوں اور توجیہوں کے اسباب بھی جُدا جُدا ہیں۔ رابرٹ لارڈ (R. Lord) نے "سدا سہاگی" ناول کو اور ژید نے "روپوش آدمی کی یادداشتیں" کو اوّل حیثیت دی تو طبقاتی انقلاب کے مخالفین مثلاً رچرڈ کرل (R. Curle) نے "بھوت پریت" (Devils) کو سب سے اہم بتایا۔ ناول میں ڈرامائی ایکشن کے رسیا آج بھی "جرم و سزا" کو سب سے بلند مقام دیتے ہیں جو شکسپیر کی ٹریجڈی کا ہم رُتبہ ہے۔

رونالڈ ہنگلے (R. Hingley) نے ادبی مقام دینے میں اس کے ناولوں کی یہ ترتیب جمائی ہے:

1. بھوت پریت (The Devils)
2. برادران کرامازوف (The Brothers Karamazov)
3. جُرم و سزا (Crimes & Punishment)
4. ایڈیٹ (The Idiot)
5. نوخیز (A Raw youth)

اکثر دانش وروں نے "برادرانِ کرامازوف" کو ہمارے عہد کا سب سے عظیم ناول گردانا ہے۔ مگر خود دستوئیفسکی کو اپنا "ایڈیٹ" دل وجان سے پسند تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دُنیا کے مسیحی ادب میں اب تک (اسپینی) سروانتے کا "دان کی خوت" (Don Quixote) اور ڈکنس کا Pick wick،

دو مُثبت ہیرو تھے، اور دونوں ہی دُنیا کی نظر میں نیک طینت نادان ہیں نے ان پر میشکن کا اضافہ کیا ہے۔ افسوس کہ روس نے اس کی قدر نہ کی۔

ایک روس کیا، ساری دُنیا نے میشکن کو اس کی عملی ناکامی کے ساتھ اپنالیا، اور پھر خود دستوئیفسکی نے اسی میشکن پر اضافہ کیا۔ اس میں زیادہ جان ڈالی اور "برادران . . . . " میں الیوشا کا کردار پیش کیا جسے وہ آگے تک لے جانا چاہتا تھا۔ عمر نے وفا کی ہوتی تو۔

جس طرح بعد میں اقبال دائیں بائیں کھینچے گئے۔ دستوئیفسکی کا بھی وہی حشر ہونا تھا: قدامت پرست اہلِ ایمان جزوِ ایمان بنا کر خالص مسیحیت کا تصور پھیلاتا ہے۔ جدیدیوں نے اسے اینٹی ہیرو اور فکری ناول کا پہلا رہنما قرار دیا۔ وجودیوں نے اسے کیرکیگارڈ (Keirkegaard) کا ہم قدم مانا اور اپنی طرف کھینچا کہ ہستی کے اثبات پر زور دیتا ہے۔ اشتراکی تنقید نگاروں نے عالم گیر انسانی دردمندی اور محنت کشوں کے درد کی ترجمانی تلاش کر کے اپنے مُرکھوں کے کئی خون معاف کر دیے اور اشتراکیت کے دشمنوں نے کہا کہ وہ مادّیت پرستی اور بے دینی سے ہر ایک فرنٹ پر لڑتا رہا ہے۔ لبرل اسے ایک روشن خیال آزادی پسند شمار کرتے ہیں اور انتہا پسند اس کی شدّتِ احساس میں انتہا پسندی دیکھتے ہیں۔

کوئی کسی نظر سے دیکھے، آج یہ عالم ہے کہ کوئی ترقّی یافتہ زبان اس کے ترجموں سے خالی نہیں! اور اُسے پڑھے بغیر کوئی شخص عالمی ادب کا طالب علم نہیں۔

یہ چند ورق

جس شخص نے افراد کے "خواب" اور قوم کے "خیال" سے لے کر مالیاتی قانون اور جنگِ جرمن و فرانس تک ایک ایک موضوع پر سوچا اور کُھل کر لکھا ہو، جو انقلابی حلقوں میں بھی شامل رہا ہو اور ان سے بدظن بھی۔ کارخانوں سے لے کر وزارت خانوں تک پُرجوش پھرا ہو۔ اس کی گہری اور بحث طلب شخصیت اور چودہ جِلدوں میں سمائی ہوئی تصنیفوں کو نہ یہ پتلی سی کتاب احاطہ کر سکتی تھی، نہ اس کے شایانِ شان ہے۔ البتہ خاص خاص جھلکیاں دکھانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

میں نے 19 ویں صدی کے روسی فنکاروں میں شاعر پوشکن، افسانہ اور ڈرامانگار چیخف کے بعد دستوئیفسکی پر قلم اُٹھایا۔ (یہ اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے) 1957 میں اس کے پہلے ناول "بیچارے لوگ" کا ترجمہ کیا تھا، پھر رفتہ رفتہ دستوئیفسکی میرا مستقل مصنّف ہوتا گیا۔ چاہا کہ اس کے تمام اہم

ناولوں کا ترجمہ کر ڈالوں۔ اب تک "ایڈیٹ" سمیت صرف پانچ جلدیں اُردو میں آئی ہیں۔ کام ابھی ادھورا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر ہمارے یہاں ادھر توجہ نہ ہوئی تو ایک زمانے تک ادھورا ہی پڑا رہے گا۔ وجہ ہے اس کی۔

یہ کتاب میں نے مونتاژ کی تیکنیک سے تیار کی ہے۔ یعنی الگ الگ تصویروں، تاثیروں اور رنگوں کو اوپر تلے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے ـــــ کہ پڑھنے والا اوّل سے آخر تک ایک سار پڑھے گا تو سوالیہ علامتوں کے جواب خود سوچتا جائے گا۔ سائے اور روشنی کا فرق بھی رکھا ہے تاکہ سوانح حیات کی طرح نہیں، تصویر کی طرح دیکھا جائے۔ سوانحی مونوگراف یوں لکھے نہیں جاتے۔ اُردو ادب پڑھنے والوں کی اوسط ذہنی سطح کو نظر میں رکھ کر یہ ورق سیاہ کیے ہیں۔ اگر یہ طرز پسند کیا گیا تو چل نکلے گا اور نہ صرف بہتر نمونے سامنے آئیں گے بلکہ بڑی شخصیتوں پر مونوگراف لکھنے کے مقررہ سانچوں میں ایک سانچہ اور بڑھ جائے گا۔

لکھنے کو لکھ لیا، لیکن ابھی تسکین نہیں ہوئی۔ ایک ایسی، عام دلچسپی کی تالیف ہونی چاہیے جس میں دستوئیفسکی کی ساری اہم تصنیفوں کا خلاصہ سما جائے۔ اور پھر ان پر لکھنے والے کا تبصرہ یا حاشیہ بھی ہو۔ دستوئیفسکی کو، میں ذاتی طور پر، تمام ہم عصروں، تورگینف، اکساکوف، استرآخت، شیچدرین، گری گوریئف، تالستائی اور [عمر میں چالیس برس چھوٹے] چیخف سے زیادہ گہرا اور افضل سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے سارے تعصبات کے باوجود روسیوں بلکہ عموماً یورپ والوں سے زیادہ، ہمارا آدمی ہے۔ ہمارے دل کی دھڑکنوں سے قریب تر ہے۔ گاندھی، آربندو گھوش اور اقبال کی تعلیمات اور تحریکوں کو کھرل کرکے اگر چھان لیا جائے تو بلا مبالغہ کہتا ہوں، اس کا نچوڑ دستوئیفسکی ہوگا۔ مگر کون کرے گا یہ کام؟ اور کیوں کرے گا؟ کس کی خاطر؟ مشرق کی جانب مُڑ مُڑ کر دیکھنے والے نامُراد مصنف کو مشرق کی یہ ہماری فاقہ مست زبان نذرانہ دینا بھی چاہے تو بھلا کیا دے سکے گی!

ظ۔ انصاری بمبئی

شروعات

پیدائش، بچپن، لڑکپن، نوجوانی

یوکرین صوبے کا رہنے والا ایک، معمولی حیثیت کا قصباتی آدمی میخائیل آندرے یوچ، ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لینے آیا۔ اور ڈاکٹری تعلیم پوری کیے بغیر ۱۸۱۲ء کی لڑائی کے وقت فوج میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈاکٹر ملازم ہوگیا۔ چھ سات سال بعد اس نے ماسکو کے ہی ایک سوداگر [خاندانی نام نچائیف] گھرانے میں شادی کرلی۔ یہیں رہ پڑا۔ ۱۹ سال کی لڑکی ماریا، بے زبان اور بچپن سے سہمی ہوئی تھی طبیعت شاعرانہ زندگی سخت مذہبی، بچوں پر جان چھڑکنے والی۔ سات بچوں کی ماں ہوکر (بعد کی دو جڑواں لڑکیوں میں سے ایک زندہ بچی)، ۳۷ برس کی عمر میں مرگئی (ان دنوں بڑا بیٹا میخائیل اور دوسرا فیودر میخائیلووچ دستوئیفسکی، ماں باپ سے اور گھر کے افسردہ ماحول سے دور پیٹرسبورگ میں زیر تعلیم تھے)

جنگ ختم ہوئی تو باپ کو ماسکو کے ایک خیراتی ہسپتال میں دیسی ڈاکٹر (حکیم) کی مستقل ملازمت مل گئی۔ ہسپتال نے اسی احاطے میں تین کمروں اور باورچی خانے کا ایک، پرانی وضع کا مکان رہنے کو دیا۔ شادی کے اگلے سال بیٹا میخائیل اور اس سے اگلے برس [نئے کیلنڈر سے] گیارہ نومبر ۱۸۲۱ء کو دوسرا بیٹا فیودر پیدا ہوا۔ پھر ایک بہن وارورا، پھر ایک بھائی آندرے۔ اوپر تلے کے ان چاروں بہن بھائیوں میں خوب بنتی تھی۔ خصوصاً بڑے میخائیل اور دوسرے نمبر کے فیودر میں (جو ہمارا موضوع سخن ہے)۔ اسپتال میں مفلس مریضوں کی آمد و رفت، دواؤں کی بو، گھوڑا گاڑی، چمنی کا دھواں، سخت گیر باپ نے اولاد کو گلی محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے، غیروں میں رلنے ملنے تک سے منع کر رکھا تھا۔ فیدیا (فیودر) بھائی بہن میں سب سے بے چین بوٹی نکلا۔ آئے دن کی شرارتیں سوچنے، تماشے والوں کی نقلیں کرنے، ہر چیز کو کریدنے، اندر جھانکنے اور جوش میں بے تاب ہو جانے کے سبب ماں باپ اُسے "شعلہ"، (پلامیا) کہنے لگے تھے۔ یہ شعلہ، گھر کی بند ہانڈی میں تھرکتا رہا۔ صبح چھ بجے اٹھنا، ڈیڑھ گھنٹے عبادت، دعائیں، ناشتہ، تیاری۔ ۸ بجے رو کھے پھیکے ڈاکٹر صاحب ہسپتال کے راؤنڈ پر نکل جاتے۔ نو بجے ذاتی گھوڑا گاڑی پھاٹک پر آتی اور وہ باہر کے مریضوں کو دیکھنے سوار ہوتے اور دوپہر کو واپسی پر جانچ شروع ہوتی کہ آج کیا کیا سبق تیار کیا۔ لاطینی کا سبق دینے بیٹھتے تو انھیں گھنٹہ بھر کھڑا

رہنا پڑتا۔ بچے اس پریڈ سے گھبراتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ تو وہیں صوفے پر دراز ہوجاتے اور یہاں بچے سہمے سہمے، کان میں بات کرتے کہ کہیں اُن کی نیند نہ اُچٹ جائے۔ تیسرے پہر ٹھیک چار بجے چائے چلتی اور ڈاکٹر گھر سے باہر نکلتے۔ شام پڑے ڈرائنگ روم میں دو شمعیں جلانا مقرر تھا۔ یہاں گھر والے جمع ہو بیٹھ جاتے اور والدین میں سے کوئی ایک تاریخی اور مذہبی کتابوں میں سے پڑھ کر سنایا کرتا۔ سب لوگ خاموشی سے سنتے۔ بچے دُہراتے اور جب اسکول میں جانے لگے تو درژاوین اور ژوکوفسکی کے کلام سے یاد کر کے زبانی سنانے لگے۔ گلی کے پتھریلے کھڑنجے اور بدرنگ پکّی دیواروں سے باہر ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عزیزوں سے کوئی واسطہ رکھا نہیں تھا، بیوی کے عزیز رشتہ دار تھے، اُن سے بھی بگاڑ لی۔ کبھی کبھار دیہات سے رضاعی مائیں چھال کے موٹے جوتے پہنے اور بڑے سے رنگین رومال میں گھر کی بنی مٹھائی باندھے آجاتی تھیں تو بچوں کا "بڑا دن" ہوجاتا۔

بیوی کی کفایت شعاری اور سلیقے کی بدولت سخت گیر شوہر نے ماسکو سے کوئی ۲۰۰ کلومیٹر تولا کے نزدیک[1] "دارووے" کی ایک زمین داری [بیوی کے نام پر] خریدی اور (اپریل ۱۸۳۲ء میں) پورا خاندان شہر سے باہر "چرماشنایا" زمین داری دیکھنے نکلا تو پہلی بار بچوں کو دیہات کی کھلی ہوا میں سانس لینے اور کھیت کھلیان کی زندگی دیکھنے کا موقع نصیب ہوا[2]۔ اس کے بعد بہار کے دنوں میں ماں اپنی زمین داری پر دیکھ بھال کے لئے چلی جاتی۔ بچے باپ کے پاس ماسکو میں رہتے۔ فیودور نے ایسے ہی ایک سال، پہلا خط ماں کو لکھا تھا۔ تیرہ برس کی عمر کا لکھا ہوا یہ کچّا خط بیٹے کی ماں سے بے پناہ محبت جتانے کو کافی ہے:

> پیاری امّاں، جب آپ چلی گئیں تو میرا دل بالکل بیٹھ گیا۔ اب جو مجھے آپ کا خیال بہت آرہا ہے تو، میں کیا بتاؤں، اتنا سارا رنج ہورہا ہے کہ کسی طرح چین نہیں پڑتا۔ مجھ سے رہا نہیں جارہا ہے کہ کیسے آپ سے ملوں۔ کب وہ خوشی کا لمحہ آئے جو آپ گھر آجائیں .....

پہلے اور دوسرے درد بھرے خطوں میں فیودور نے ماں کی جدائی پر آنسو ٹپکائے ہیں، اپنی آیا کی تپِ دق کی بیماری پر افسوس کیا ہے، اور چھوٹی بہنوں کو بہت بہت پیار لکھا ہے۔ تقاضا کیا ہے کہ جلدی سے آجائیے اور بہنوں کو بھی لے آئیے۔

---

(۱) یہاں سے قریب "یاسنایا پولیانا"، میں لیو تالستائی کی زمین داری اور عالی شان بنگلہ تھا، جہاں وہ بعد کے برسوں میں رہا اور اب تک سیاحوں کی زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ ظا

(۲) یہی گاؤں "دارووے" اور "چرماشنایا" اس کے آخری ناول "برادران کرامازوف" کی جائے واردات بنے ہوئے ہیں۔ اب یہاں دستوئیفسکی کے نام پر بڑا پنچایتی فارم ہے۔ ظا

ماں کی ایک ہی بہن تھی الیکساندرا، جن کی شادی اسکو کے کسی مالدار بیوپاری ٹکوانین سے ہوئی تھی۔ وہ ملنے آئیں تو دونوں بھانجوں کو ساتھ لیتی گئیں۔ انھیں ماسکو کے نزدیک خانقاہ کی زیارت کو جانا تھا۔ راستے بھر بچے انھیں روسی نظمیں سناتے گئے۔ فیودر تو پوشکن کے کلام پر فدا تھا، وہی سنایا۔ خالہ جو رفتہ رفتہ اپنے بدمزاج بہنوئی سے ایسی خفا ہوئیں کہ دوسرے سسرالی عزیزوں کی طرح انھوں نے بھی ادھر سے منھ پھیر لیا۔ میخائیل اور فیودر کی خوش مذاقی اور ذہانت کا یہ واقعہ ہمیشہ سنایا کرتی تھیں۔ (۱)

با اصل ابتدائی تعلیم گھر پر ہو چکی تھی۔ قصے کہانیوں کی، تاریخی و مذہبی کتابیں الٹنے پلٹنے کا شوق گھر کی بے لطف یکسانی نے لگا دیا تھا۔ دس سال کے ہوئے تو بچوں کو کسی فرانسیسی ٹیوٹر کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا، جہاں درجہ چار تک کی تعلیم پوری کر کے وہ ایک اور بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیے گئے۔

۱۸۳۷ء ان نونہالوں کے لیے بڑے شگون لایا۔ سال شروع ہوتے ہی دو حادثے ایسے ہوئے جو تمام زندگی پر برے اثر ڈالنے والے تھے۔ پہلے تو تپ دق سے ماری ہوئی ماں کا انتقال ہوا اور پھر چند روز کے بعد لڑکوں کے محبوب شاعر پوشکن کے مارے جانے کی خبر پھیلی۔ فیودر تو اس غم میں سیہ پوش ہو جانا چاہتا تھا، لیکن سوگ کی دوسری وجہ پہلے سے موجود تھی۔

بیوی اپنی سہار کے بل بوتے پر گھر سنبھالے بیٹھی تھی (اگرچہ شوہر کی نظر میں اس کا چال چلن برابر مشکوک رہتا تھا) اس کا سایہ اٹھتے ہی خیمہ اکھڑ گیا۔ بڑے میاں نے بڑی لڑکی کی شادی کر دی، اپنے گھر سے رخصت کیا، دونوں لڑکوں کو پیٹرسبورگ لے کر چلے ملٹری انجینیرنگ اسکول میں داخل کرنے۔ یہاں ستمبر ۳۷ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد فیودر کو داخلہ مل گیا۔ بھائی میخائیل جسمانی کمزوری کی بنا پر فیل ہوا، اس نے ریول، کے ملٹری انجینیرنگ کور میں کوشش کی، وہاں داخل ہو گیا۔ فیودر کے اسکول اور بورڈنگ کی فیس اکثر انھی خالہ خالو کی طرف سے ادا کی جاتی تھی کیوں کہ قابلیت کا جو وظیفہ (اسکالرشپ) اسے ملنا چاہئے تھا وہ سفارش لانے والوں کو مل گیا اور کثرتِ اولاد کے سبب یہ بوجھ باپ کے بس سے باہر تھا۔ اتفاق سے اسی شہر میں باپ کے ایک لائق (مگر شاعری کے خبط میں مبتلا) ملاقاتی تھے شِدلوسکی۔ بکھرا ہوا چہرہ، بہتی آنکھیں، جھکے ہوئے کاندھے — مطالعے میں غرق۔ انھوں نے بن ماں کے ذہین بچے پر شفقت کی اور کلاسکی ادب کے مطالعے کا چسکا لگا دیا۔ انھی کی بدولت فیودر نے طالب علمی کے زمانے

---

(۱) یہی الیکساندرا کومانینا خالہ تھیں، جن کے لاوارث مرنے پر دستوئیفسکی کو آخری عمر میں بڑی رقم اور جائداد ملی اور اسی کے ساتھ خاندانی چپقلش بھی۔ ناولٹ "جواری" میں مصنف نے ان کی ایک جھلک دکھا دی ہے۔ ظا

میں شیکسپیر، بالزاک، شیلر، ہافمین اور والٹر اسکاٹ کی تصانیف پڑھ ڈالیں۔ مشکل مقامات وہ خود سمجھا دیتے تھے (۱)۔ بھلا ایسے پڑھاکو، اور اپنے سن و سال سے زیادہ سنجیدہ اور مفلس طالب علم کا کھلنڈرے، بے فکرے اور ادبیات کی طرف سے بد شوق ہم عمر طالب علموں میں کیا جی لگتا۔

یوں بھی یہاں ڈسپلن کی سختی گھر سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

.....فوجی پریڈ کے وقت قطاروں میں سے ذرا کسی کی سنگین، دھوپ کا سامنا کرتے وقت کانپ جاتی تو سرجنٹ غصّے میں ڈانٹ پلاتا: خبردار! ہوشیار، دھوپ کا خیال نابکار، پریڈ پر دھوپ کچھ نہیں۔" سال کے پہلے تین مہینے میں دستوئیفسکی صرف پانچ پریڈوں میں شریک ہوا اور پانچوں پر بڑے ڈیوک..... اور بادشاہ سلامت نے بذات خود معائنہ کیا.......کڑے ڈسپلن اور سخت مشقت طلب کام کا بار تو ایک حساس لڑکے پر گراں تھا ہی، اس سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوگیا اسکول کے ساتھیوں کا بے شعور ظالمانہ برتاؤ اور بے لوچ رسمی حرکتیں....." (ایر موئیسکی ص۲۷)

یہ وہی رسمیں تھیں: جونیئر طلباء کا سینیئر لڑکوں کے ہاتھوں ستایا جانا۔ غریبا مئو گھلیے پر پھبتیاں، تحقیر، اور ہم جماعت لڑکوں سے الگ تھلگ اور گروہ بندی سے پاک رہنے کی سزا۔

بھوؤں کے اندر گہری چمکیلی اور بے قرار آنکھوں والا۔ زرد رو لڑکا ڈھیلی ڈھالی وردی کا، گویا، بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد، ہنسی مذاق اور جملہ بازی والے یار باشوں سے کترا کر وہ کمبل لپیٹے، بورڈنگ کے بڑے ہال میں، مدھم روشنی تلے، میز کے سامنے ڈٹ جاتا اور رات ڈھلے تک مطالعہ کرتا رہتا۔ رات کا سناٹا اسے محویت اور ایک روحانی کیفیت عطا کرتا تھا۔ اس کا نام ہی "فوٹیس" (ومدنیلا ص۲۹) پڑ گیا تھا — یعنی مشرقی کلیسا کا علم بردار بڑا بازنطینی پادری۔

سالانہ امتحان میں اس نے پرچے اچھے کیے، لیکن استادوں سے گستاخی کی پاداش میں فیل ہوگیا۔ ایک تو ہم جشموں میں جگ ہنسائی اوپر سے بے درد باپ کے غصّے کا خوف۔ فیوڈر بیمار پڑ گیا اور کئی دن بُری طرح بیمار پڑا رہا۔

بیماری کا ایک سبب وہ محتاجی بھی ضرور ہوگی جو باپ کی طرف سے جیب خرچ نہ پہنچنے کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے معذرت ناموں میں باپ سے دس بیس روبل کی بھیک مانگتا نظر آتا ہے:

.... بارش کے موسم میں جب پتلے کپڑے کے خیمے میں پانی ٹپک چکا ہو، ایسے میں آدمی فوجی پریڈ

---

(۱) دستوئیفسکی کے ناولوں میں کہیں نہ کہیں ایسا ایک مشفق کردار ضرور مل جاتا ہے جسے شدنوفسکی کی یاد نے رنگ روپ دیا ہو۔

کر کے تھکا ماندہ سردی ہارا اپنے ٹھکانے پر آئے اور [گرم] چائے نہ ملے تو بیمار ہوگا ہی۔ پچھلی سردیوں میں جنگی مشقوں کے بعد یہی ہوا۔ میں بیمار پڑ گیا۔ پھر بھی آپ کا ہاتھ تنگ ہے تو میں چائے نہیں پیا کروں گا۔ جو چیزیں انتہائی ضروری ہیں صرف وہ مانگتا ہوں: دو جوڑے معمولی سے بوٹ جوتے، "سولر روبل کے: اور پھر میرا سامان، کتابیں، جوتے، قلم، کاغذ وغیرہ وغیرہ، انھیں بھی احتیاط سے رکھنے کو جگہ چاہیے۔ اس کے لئے الماری کی ضرورت ہے۔ کیمپوں میں تو سوائے ڈیرے تمبو کے کوئی عمارت ہے نہیں ....."

بڑے بھائی کو لکھتا ہے کہ ویسے تو ہمارے باپ بھلے آدمی ہیں۔ ان کی حالت پر ترس آتا ہے لیکن تم ہی سفارش کرو، سمجھاؤ کہ میں ایسی بدحالی میں اور لڑکوں کو کیا منہ دکھاؤں۔

شِدَنوفسکی نے ادب اور تاریخ کا، کلاسیکی تصانیف کا جز و ورق چکایا، وہ تو تھا ہی لیکن ابھی فیودور کے گالوں پر سبزہ آغاز ہو رہا تھا کہ اسے ایک اور ہم مذاق نوجوان مل گیا جو رومانی ادب کا سمراذوق لئے پھرتا تھا۔ اس نے اپنے نئے آشنا فیودور کو جرمن رومانی شاعر شیلر(۱) اور اس کے شدید جذباتی الم پسند کلام سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ تن بدن میں اُتار دیا؛ شیلر کا رومانی اندازِ نظر اور غم پسندی، احساسِ تنہائی اور لطفِ بیان، اس دوست کی رفاقت سمیت نوعمر فیودور کی زندگی کی رسیلی یاد بن گئی "... اس عزیز سے دوستی نے مجھے آشنا ستایا، ایسا مزہ دیا کہ بس! اب میں کبھی اس پر زبان نہیں کھولوں گا۔ شیلر کا نام میری متاعِ حیات بن گیا ہے؛ ایک جادو بھری آواز جس کے سنتے ہی نہ جانے کتنے سارے خواب جاگ اُٹھتے ہیں ......"

دستوئیفسکی نے اس رفیق کا نام کبھی نہیں لیا، مگر ایڈورڈ کار (Carr) نے اشاروں سے نتیجہ نکالا ہے کہ مصنف اس نوعمری اور احساسِ تنہائی میں اپنی جذباتی یکسوئی کے ساتھ کسی ہم عمر، ہم جنس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا " نشوونما کے اس مرحلے پر قرینِ قیاس بات ہے کہ پیشِ نظر مرد ہے، عورت نہیں .... (ص۱۲) تب تک وہ رومانی شاعروں اور شاعری سے ہی آنند لیتا تھا اور معاملے کے عملی پہلو سے آگاہ نہیں تھا۔

باپ کو ایک اندیشہ یہ بھی لگا رہتا تھا کہ اگر اولاد کے ہاتھ میں اوپر سے خرچ کرنے کو چار پیسے بچ رہے تو وہ پردیس میں ضرور پَر نکالے گی۔ بزرگوار اپنی دو بچیوں اور پُرانی آشنا کے ساتھ دیہاتی زمین داری میں پڑے تھے۔ زیادہ پینے لگے تھے، گالیاں بکتے تھے اور فیودور بیٹے کو جھڑک کر لکھتے تھے کہ فصل برابر

---

(۱) شیلر (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۵ء) جرمن شاعر، تاریخی ڈرامہ نگار، ناولسٹ اور فنونِ لطیفہ کا تنقید نگار۔ گوئٹے سے دس سال چھوٹا تھا۔ شیلر اور گوئٹے کے درمیان ادب اور فنون پر علمی خط و کتابت ([illegible]) نے جرمن ادب میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ۱۷

خراب ہو رہی ہے۔ میں نے خود بھی چار سال سے کپڑے نہیں بنوائے۔ چڑچڑے پن میں رعایا کو ماں بہن کی گالیاں سناتے۔ ڈنڈا اُٹھا کر لپکتے۔ دماغ بھی چل گیا تھا۔ بہ آوازِ بلند مرحومہ بیوی سے باتیں کرنے لگتے۔ آخر جون ۱۸۳۹ء کی ایک گرم دوپہر کو جب وہ رعایا کے کسی آدمی پر بہت گرم ہوئے تو پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق درجن بھر آدمیوں نے دہیں گلا گھونٹ کر ٹھنڈا کر دیا اور لاش سڑنے کے لیے جنگل میں پھینک دی۔ ٹھیک اسی روز بڑے بیٹے نے خواب میں باپ کو ایسے حال میں دیکھا کہ وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بعد میں فیودر نے خبر دی کہ باپ زمین داری میں مارے گئے۔ باپ کی زیادتیاں، کسی رکھیل کے ساتھ دن رات شراب نوشی، گالی گفتار اور پھر یہ بدبختانہ قتل۔ ۱۸ برس کے نوجوان فیودر کے اوسان خطا ہو گئے اور پہلی بار مرگی کا دورہ پڑا۔ اُدھر پولیس تفتیش کے لیے گئی تو دیکھا کہ مقتول کے وارث اور رشتہ دار پہلے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ قاتلوں کا فوراً سراغ لگ گیا۔ سارا واقعہ معلوم ہو گیا لیکن اب اگر فوجداری مقدمہ دائر ہو تو زمین داری کے تندرست مرد لپیٹ میں آتے ہیں اور انھیں کی محنت اگلی فصل اور گزر بسر کا سہارا بننے والی ہے۔ پھر اس میں عام بدنامی کا بھی اندیشہ ہے کیوں کہ مقتول اپنی رعایا میں آبرو کھو چکا تھا۔ غرض اونچ نیچ دیکھ کر یہ طے پایا کہ پولیس رپورٹ میں موت کا سبب [illegible] کا دورہ درج کرایا جائے۔ سب عزیزوں نے مصلحت جان کر ہونٹ سی لیے۔ قضیہ رفع دفع ہوا۔ یہ واقعہ دستوئیفسکی کے دل کا وہ داغ تھا جو نہ کبھی دُھلا، نہ زبان پر آیا —— یہاں تک کہ "برادران کراما زوف" اپنے آخری تصنیفی کارنامے میں ایسے ہی واقعے کو پلاٹ کی بنیاد بنا کر قلم کی نوک سے پُرانے داغ کی سیاہی ٹپکا دی۔ طالب علمی کا دَور، تنہائی اور بے بسی کا احساس، آئے دن کی محتاجی —— اتنے میں باپ کی موت، وہ بھی شرم ناک حالات میں، جن کا ذکر زبان پر لاتے ہوئے دستوئیفسکی ہمیشہ کتراتا رہا۔ لیکن شر میں خیر کا پہلو نکل آیا۔ خستہ حال زمین داری کو جس کا گاؤں ایک بار جل کر خاک ہو چکا تھا۔ سب سے چھوٹی لڑکی کے بالغ ہونے تک نیلام یا فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انتظام کسی ٹرسٹی کے سپرد کرنا تھا۔ فیودر کی چھوٹی صرف سترہ سال کی بہن وآروارا نے پکّی عمر کے ایک صاحبِ حیثیت شخص کرے پن نے شادی کر لی، اور زمین داری کی دیکھ بھال اپنے ذمّے لے لی اور نوٹوں کا وہ بنڈل بھی نکل آیا جو بڑے میاں نے بیٹی کے جہیز کے لیے الگ سے رکھ چھوڑا تھا۔ اور یوں میخائیل اور فیودر دونوں بھائیوں کو آبائی زمین سے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ میخائیل نے تو دوسرے ہی سال [اس آمدنی کے بَل پر، جس سے بڑی خوش فہمیاں تھیں] اپنا گھر بسا لیا۔ فیودر نے اسکول سے الگ کرائے کا کمرہ لے لیا، خطوں میں تقاضے شروع کر دیے کہ مجھ پر

قرض بہت ہوگیا ہے، اِتنا نہیں، اُتنا ملنا چاہیے :

ذرا اندازہ کرو، برادرِ عزیز، کہ مجھے آٹھ سَو روبل ادا کرنے ہیں۔ ان میں ۵۲۵ تو مالک مکان ہی کو دینے ہیں (میں نے گھر والوں کو لکھا ہے کہ ڈیڑھ ہزار روبل کا مقروض ہوں۔ تجربے نے سکھا دیا ہے کہ جتنا طلب کیا جائے اُس کا صرف تہائی وصول ہونے والا ہے ......

ماں باپ کے اُٹھ جانے کے بعد فیودَر نے چھوٹے بھائی آندرئے کو بھی تعلیم کی خاطر اپنے پاس بلالیا۔ خرچ بڑھ گیا۔ ہاتھ کھُلا ہوا تھا، احتیاط سے روپیہ رکھنے کا سلیقہ نہ تھا، جوئے بازی کی تھوڑی بہت لت لگ گئی۔ ملنے جلنے والوں کو بھی تسکار ہاتھ لگا۔ پھر افلاس نے گھیرا۔ بڑے بھائی میخائیل کے نام ۲۲ دسمبر ۱۸۴۱ء کا خط ہے، جس میں شادی کی مبارک باد کا صرف ایک جملہ ہے اور باقی اپنی پریشانیاں :

.... قسم لے لو، اب میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ اکیلا دم ہوتا تو تمہاری خاطر اپنی ضروریات قربان کر دیتا مگر بھائی کا خرچ بھی میرے سر ہے ......

...... بیمار ہوگیا۔ سخت پریشان ہوں۔ اس [لڑکے] کی وجہ سے کتنی مصیبت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اسے اسکول کے لئے تیار کرنا۔ اور پھر اپنے پاس رکھنا؛ تنہائی، آزادی، اور بے تعلقی کی جس حالت میں جیتا ہوں، اس میں یہ ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے، نہ کام کر سکتا ہوں، نہ تفریح۔ سمجھے تم۔ اور پھر طبیعت بھی اُس نے ایسی عجیب اور خشک پائی ہے کہ ہر شخص اس سے کتراتا ہے۔ اس دن کو روتا ہوں جب یہ حماقت کی کہ اسے اپنے ٹھکانے پر رہنے کو لے آیا....

اگلے سال آندرئے نے ملٹری انجینیرنگ اسکول میں داخلے کا امتحان پاس کرلیا اور بے اولاد سے خالہ خالو نے انعام میں سَو روبل یک مشت بھیج دیئے تو فیودَر نے خط پر خط لکھ کر اس سے بھی پانچ روبل قرض طلب کر لیے۔ (۱)

خدا خدا کر کے فیودَر نے [پہلے سال الجبرا میں فیل ہونے کے باوجود] بائیس برس کو پہنچتے پہنچتے جون ۱۸۴۳ء میں آخری امتحان دیا۔ اسکول ٹیچروں کی رپورٹ اتنی اچھی تھی؛ چال چلن اور دینیات میں نمبر اول، نہایت محنتی اور ذہین طلبا میں شمار ہوتا تھا، اگر علم الحساب میں کمزور یا بدشوق نہ ہوتا تو کلاس میں اوّل آتا۔ بہر حال پاس ہوگیا۔ لیکن اسکول کے خاص مضمون میں امتیاز کی بدولت اسے ہاتھ کے ہاتھ نوکری مل گئی۔

---

(۱) ویسے یہ بھائی عمر بھر ممنون رہا اور دستوئیفسکی جیسے تیسے ماہانہ رقم سے اُس کے گھر والوں کی پرورش کرتا رہا۔ بعد میں اسی کے قلم سے نکلی ہوئی یادداشتیں اعتبار کے قابل بھی گئیں۔ خ ا

ابھی وہ امتحان میں کامیابی کی دعوت دے رہا تھا کہ پیترسبورگ انجینیرنگ کور میں ڈرافٹسمین (نقشہ نویس) کی کرسی خالی ہوئی اور اسے بلا وا آگیا۔ دو مہینے بعد وہ سب لفٹننٹ کی وردی پہنے اس کرسی میں پھنسا ہوا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

سب لفٹننٹ مسٹر فیودر میخائیلو وچ دستوئیفسکی پابندی کے ساتھ دفتر آتا کوٹ کے بٹن چمکائے مگر منہ لٹکائے ہوئے۔

پہلی تنخواہ ہاتھ میں آئی تو سات کمروں کا بڑا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ کاغذ کے بارہ سو روبل سالانہ کرایہ تھا، مگر کرایہ دار کو مالک مکان کی شریفانہ صورت پسند آگئی، آنکھ بند کر کے لے لیا (ا) سردیوں میں اسے گرم کرنے کا انتظام تھا نہ قاعدے کا فرنیچر لگانے کا خرچ۔ دو ہی کمروں میں اُٹھنے بیٹھنے کا فرنیچر لگا۔ کئی نوکر رکھے گئے۔ ان میں ایک ریٹائرڈ فوجی سائمن تھا، جسے لٹنے کی عادت تھی اور ضرورۃً چوری کی بھی۔ صاحب خانہ نے تغافل برتا: ارے چرانے دو، آخر وہ بھی ضرورت مند ہے۔ اور میں اس کی چوری سے کوئی برباد تو نہیں ہو جاؤں گا، ایک گھریلو ملازم نے موقع غنیمت جان کر اپنا گھر بار بھی یہیں بسا لیا۔ تنخواہ اور آبائی زمین سے مل ملا کر پانچ ہزار روبل سالانہ کی سبیل بن گئی تھی۔ مگر اندر باہر کے سارے خرچ آمدنی کی امید سے شرط باندھ کر آگے نکل جاتے، اور گلی کی دوکان سے اُدھار کے دودھ روٹی پر کئی کئی وقت گزارنے پڑتے۔

میخائیل کے ہاں پہلی ولادت ہوئی تو فیودر بھتیجے کی نام رکھائی کی تقریب میں ریول گیا۔ وہاں بہن بھائی ملے۔ فیودر کی ہونق صورت اور حلیے کی دُرگت دیکھ کر دونوں گھبرا گئے۔ بھائی کا ایک جرمن دوست ڈاکٹر (Rasenkampf) تھا جسے پیترسبورگ میں ڈاکٹری پریکٹس کے لئے جگہ درکار تھی۔ طے پایا کہ فیودر کے باقی دو کمرے اسے کرائے پر دے دیے جائیں۔ اس بہانے نوجوان لفٹننٹ کی آمد و خرچ پر ایک کفایت شعار اور ضابطہ پسند دنیا دار کی نگرانی چوکی بھی بیٹھ جائے گی۔ ڈاکٹر کے پاس مریض آنے جانے لگے۔ صاحب خانہ کی آنکھیں دُکھ اور بیماری کے مناظر اور ہمدردی

(ا) کاغذ کے نوٹوں میں تین روبل برابر تھے چاندی کے ایک روبل کے۔ بار بار کی جنگوں نے چاندی کے سکے کی قیمت بڑھا دی تھی اور نوٹوں کی گھٹا دی تھی۔

کی پہلے ہی سے [خیراتی ہسپتال میں] عادی تھیں، یہاں بھی انھوں نے مریضوں کو ٹٹولنا اور دل جوئی کرنا شروع کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا کوئی اُس کے قیمتی وقت پر ہاتھ صاف کرتا، کوئی جیب پر۔

..... ایک دن دستوئیفسکی [مکان کے شریک] ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور بڑے اعتماد سے بتانے لگا کہ ’ابھی ابھی ہزار روبل ماسکو سے آئے ہیں‘، دوسرے دن وہ پھر آیا اور لجاجت سے صرف پانچ روبل قرض مانگنے لگا۔ وہ جو ایک ہزار روبل کی رقم تھی اس کا ایک حصہ تو بلیرڈ (Billiard) کی بازی میں ہارا اور باقی اُس درزی نے مار دیا جس سے نئے کپڑے سلوائے تھے ....

تاش کی میز، یار باشی کے اڈّے، ریستوراں اور مہمانوں کی آئے دن کی دعوتیں ماہانہ آمدنی کو کفایت نہ کر سکیں۔ رات بھر شمع کا جلنا اور سگرٹوں کا دھواں بھی کچھ نہ کچھ کاغذ کے نوٹ پھونک ہی ڈالتا تھا۔

ایک دن پیٹرسبورگ میں خبر پھیلی (جولائی ۱۸۴۳ء) کہ بالزاک آیا ہوا ہے (۱) قاموسی، حقیقت پسند، انقلابی ناول نگار بالزاک، جو بچپن سے فیودر کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ جوش میں [اور غالبًا آمدنی بڑھانے کے خیال سے بھی] سوجھی کہ اس کے ناول ’یوژینے نی گران دے‘ (Eugenie Grandet) کا روسی ترجمہ کر دیا جائے۔ ترجمہ کرنے بیٹھا تو وہ اصل سے کہیں زیادہ شوخ ہو گیا۔ جب اڈیٹر کے پاس اشاعت کے لئے لے گیا اس نے اصل سے ملایا تو بڑا فرق پایا۔ کاٹ پیٹ نوجوان مترجم کو گوارا نہ ہوئی۔ رسالے میں یہ ترجمہ درست ہو کر نکلا ضرور، لیکن ایک تو غصہ آیا اڈیٹر کی سینہ زوری پر، دوسرے یہ کہ معاوضہ وہ نہ ملا جس کی امید تھی۔ بڑے بھائی کو لکھا کہ آؤ، ہم تم مل کر ترجمے کا کام سنبھالیں۔ ۱۸۴۴ء سال کی آمد پر، بڑی اُمنگوں کے ساتھ لکھا ہوا ایک خط ملتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ:

..... بہنوئی نے جائداد کے حق میں صرف پانچ سو روبل بھیجے تھے، دے دلا کر دو سو [چاندی کے] روبل کا قرض ادا کرنا رہ گیا۔ کنوئیں سے پانی خود بخود نہیں نکلا کرتا ..... مجھے خوش قسمتی سے ایک نسخہ سوجھ گیا ہے، تم بھی اس کے نفع نقصان میں شریک ہو جاؤ تو اچھا ہے۔ دو برس پہلے (Mathilde) (۲) ناول کا صرف سولھواں

---

(۱) اَونرے دے بالزاک (۱۷۹۹ء – ۱۸۵۰ء) فرانسیسی مصنف، سات برس کی جدائی کے بعد اپنی پولش محبوبہ مادام ہنسکے سے ملنے آیا تھا۔ یہ واقعہ اس کے معاشقوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ’یوژینے نی گران دے‘، ناول ۱۸۳۳ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ دس برس بعد دستوئیفسکی نے اس کا [ناقص] ترجمہ کیا تو یہ اس کی پہلی کوشش تھی۔ ظا

(۲) Mathilde فرانسیسی مصنف یوژے نی سیو (Eug - Sue) کا عام پسند ناول۔

حصّہ روسی میں ترجمہ ہوکر چھپا تھا۔ پبلک کو اشتیاق ہے، مسٹر تیتن، میں اور تم اپنی اپنی محنت، روپیہ اور کوشش ملاکر اپریل تک پورا ناول چھاپ دیتے ہیں۔ چھپنے تک ناول کو سنسر سے گزرنا ہوگا۔ سنسر چیف سے مسٹر تیتن کی پہچان ہے۔ وہ جلدی سے پاس کرالیں گے۔ ہماری واقف کار ایک فرم ہے ساڑھے چار ہزار [نوٹ] روبل میں کام پورا ہوجائے گا۔ ساتھ سو ان کے پاس ہیں۔ پانچ سو روبل مجھے جنوری تک وصول ہوجائیں گے، ورنہ تنخواہ پیشگی لے لوں گا۔ تم فروری تک پانچ سو کی رقم ڈالو۔ نہ ہو تو تنخواہ کی ضمانت پر لے لو۔ ہم اس حجم پونجی میں کتاب نکال دیں گے [چاندی کے] چار روبل فی کاپی سے تین سو کاپی میں ہماری اصل لاگت نکل آئے گی۔ اگر آٹھ حصّوں میں ناول چھاپ کر بیچ دیا تو ساٹھ ہزار روبل کا صاف منافع ہے..... اب بتاؤ شریک ہوتے ہو؟ .....“

بھائی کو، شاعرانہ حرکتوں کے باوجود، کاروبار کی سمجھ خوش فہم فیودر سے زیادہ تھی، وہ شریک نہیں ہوا۔

پھر زور دے کر لکھا کہ ”خدارا۔ تم [شیلر کے] ڈان کارلو ”Don Carlos“ کا فوراً ترجمہ کر ڈالو۔ ہم اپنے خرچ سے چھپوائیں گے۔ اور کچھ نہیں تو پیشگی تنخواہ نکلوالوں گا، پہلے بھی کئی بار نکلوا چکا ہوں۔ اس کام میں خطرہ کچھ نہیں، منافع ہی منافع ہے....

بھائی میخائیل آخر شیلر کے روسی ترجمے پر لگ گیا۔ فیودر دستوئیفسکی نے اس کام کی بڑی تعریف کی مسودہ لے کر اڈیٹروں اور پبلشروں میں گھوما..... بڑے پاجی ہیں دونوں۔ پورا ترجمہ اپنے رسالے میں ڈالنے کی تجویز پر غور کرنے کو بھی تیار نہیں۔ سٹہ باز ہیں، اچھے خیالات ان کی کھوپڑی میں نہیں گھستے...... انھیں ترجمہ چھاپنے میں سنسر کا خوف ہے۔ چیف سنسر جب تک اسے ایک ہتائی کاٹ نہ دے، اجازت دینے کی ذمہ داری اپنے سر لینے والا نہیں.... خیر، ترجمہ ہم خود چھاپیں گے..... بک سیلر اور پبلشر کُتّے کہیں کے۔ اب پہچان گیا ہوں۔ روپیہ کا بندوبست کرکے ہم اشاعت کی ذمہ داری لیں گے۔ ماسکو والوں پر دباؤ ڈالنا پڑے گا۔“

یہ ماسکو والے کون تھے؟ بہن بہنوئی ــــ آبائی زمین داری کے ٹرسٹی۔ جنھیں سب لفٹننٹ نے، پہلے بھی تقاضے کے خط پر خط لکھے تھے: اس بار خوب جم کر لکھا اور بتایا کہ

”حالات کے تقاضے سے مجبور ہوکر میں نے نوکری سے استعفا دے دیا ہے۔ دو ہفتے میں اوپر سے منظوری آجائے گی۔ میں آپ کو پہلے ہی خبر دیتا، مگر ڈاک خرچ جیب میں نہیں تھا۔ کرسی سے اُٹھتے ہی رات کا ٹھکانا چھن جائے گا۔ کرایہ ادا نہیں کیا ہے، مالک مکان خالی کرالے گا۔ اب یا تو سڑک پر بستر لگاؤں گا یا قازان چرچ کے برآمدے میں پاؤں پسارروں۔“ مگر یہ دونوں صورتیں ناروا

> ہیں۔ رہنے کو بہر حال جگہ چاہئے، مشکل ہے کہ آدمی سرکاری مہمان بن جائے۔ یہ بھی ہے انتہائی مجبوری کی صورت۔ خدا کا شکر ہے کہ وہاں تک میں ابھی پہنچا نہیں .....،
>
> غرض اسی طرح کچھ طنز، کچھ چھیڑ چھاڑ، کچھ تقاضا کرتے کرتے وہ بر سرِ مطلب آتا ہے کہ "میں جائداد میں اپنے حق سے دست برداری لکھ دیتا ہوں۔" ہزار روبل [چاندی کے] اس کی سالانہ آمد ہے کوئی ایک ہزار روبل میں مجھ سے میرا حق خرید لے۔ پانچ سو روبل نقد چاہئے۔ باقی پانچ سو روبل قسطوں میں۔ تین مہینے پہلے (مئی میں) اپنی پوری تنخواہ ایڈوانس لے چکا ہوں۔ اب میرے پاس نقد کی صورت میں ایک کا پک تک نہیں۔ پہننے کو کپڑے نہیں اور قرض سے چھٹکارا نہیں ...
>
> آپ، جناب کرستے پین صاحب، جائداد میں میرا حصہ ہاتھ کے ہاتھ بکوا دیجئے.....

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اچھی خاصی نوکری چھوڑنے کا خیال دو وجہوں سے آیا: ایک تو روز روز کی گھس گھس سے تنگ آکر، وقت بچا کر وہ ادبی سرگرمیوں میں سر کھپانے کے لئے بے قرار تھا۔ آٹھ دس مہینے کے روزانہ معمول نے بتا دیا کہ نوکری اور ادب دونوں سے بیک وقت نباہ نہیں ہونے والا۔ دوسرے یہ کہ اسکول کے پرانے ساتھی گری گورووچ سے ایک دن سرِ راہے ملاقات ہو گئی۔ (۱) وہ ایک خوش اوقات اور یار باش، دل کش نوجوان تھا اور قلم اٹھاتے ہی اچھا خاصا ہونہار مصنف بن چکا تھا۔ دستوئیفسکی نے بتایا کہ برادریں تو کشتی جلا کر ادب کے کام میں کود پڑوں گا۔ اس نے ہمت بندھائی کہ فکر مت کرو، اس میں روٹی کا ٹوٹا نہیں ہو گا۔ دونوں نے مل کر ایک مکان کرائے پر لیا۔ پاس کی دوکان سے پاؤ روٹی اور ٹرکوا س" کا شربت ادھار آنے لگا۔

پہلوٹی کی تصنیف

سال بھر پورا ہوتے ہوتے جب دستوئیفسکی کا استعفا داخل ہوا (جس کی خبر قرض خواہوں سے بہت دنوں چھپائے رکھی) تو اس کے پاس وردی کے علاوہ پہننے کو کپڑے تک نہیں تھے۔ اور وہ شب و روز کاغذ کو سیاہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

> .... بس ایک امید ہے۔ ایک ناول پورا کرنے والا ہوں (بالزاک کے 'یوژسے نی گران دے' کے سائز کا ہو گا اور یجنل ناول ہو گا۔ آج کل اسے صاف کر رہا ہوں۔ رسالہ 'وطن کی تحریریں' کو دوں گا۔ غالباً چار سو روبل تو مل ہی جائیں گے .....

---

(۱) دیمتری واسیلی ویچ گری گوری ووچ، دستوئیفسکی کا ہم عمر، ہم قلم اور بعد میں اس کا مداح اور مددگار، اس کی یادداشتیں دستوئیفسکی کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات جاننے میں نہایت معتبر اور کار آمد ہیں۔ ظ ا

وہ ماسکو والے بڑے ہی خودغرض، احمق اور جھکی لوگ ہیں..... کرسے پین نے مجھے صلاح دی ہے کہ میاں شکسپیر کی ہوا میں مت اڑو۔ اس کا کہنا ہے شکسپیر کیا تھا، صابن کا جھاگ۔ بھلا شکسپیر کو ان [مسخروں] سے کیا لینا دینا..... !

دن رات اوسطا سائز کے پہلے ناول پر آنکھیں ٹپکانے کا سبب ایک تو یہی امید تھی کہ چار پیسے ہاتھ آئیں گے، دوسرے یہ بھی مجبوری رہی ہوگی کہ باہر، تمیز داروں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے لئے نوعمر اور نومشق مصنف کے پاس قاعدے کا پتلون بھی نہیں تھا۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل نکتہ یہ کہ سال بھر کی نوکری نے اس کے تیز مشاہدے کو تھکی ہاری کلرک مخلوق کا ایسا نمونہ دے دیا تھا جسے وہ چپ چاپ پی سکتا تو قلم سے صرف دفتری فائل بھرنے کا ہی کام لیتا۔ وہ نہ پی سکا تو فائل بھی اسے ہضم نہ کر سکے —— ادب کے بھنور میں ڈال دیا، جہاں تہی دستی کا سبب بھی وہی تھا جو اس کا نتیجہ، یعنی آتمائی آگ، تخلیق کا جنون۔

۲۴ برس کا وہ شخص، جو رومانی ناولوں کی فضا میں، شیلر اور پوشکن کی شدید جذباتیت میں نوعمر تخیل کو پال چکا تھا، واقعی اپنے ذاتی مشاہدے کا سیدھا سچا، مگر تڑپا دینے والا وجود، خود اپنی ہستی سے شرمانے والا ایک پشیمان سا خدا ترس کلرک، مرجھائے ہوئے دل کی دنیا سمیت کاغذ پر اتار دینے میں لگا تھا۔

۱۸۴۴ء کی سردیاں گزر گئیں۔ پے در پے دو موسم اس کے سر پر سے نکل گئے اور اسے خبر نہ ہوئی۔

شاید تم جاننا چاہتے ہو گے کہ جس وقت میں لکھتا نہیں، تب کیا کرتا ہوں؟ تب میں پڑھتا ہوں۔ بہت سارا پڑھتا ہوں۔ پڑھنے پڑھانے کا عجب اثر ہوتا ہے مجھ پر۔ جو چیزیں پہلے کبھی مطالعے میں آچکی ہیں، انھیں پھر سے پڑھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ نئی قوت اس میں لگا رہا ہوں، اس قابل ہوتا جا رہا ہوں کہ ہر چیز کے اندر اتر جاؤں اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لوں اور اس کی بدولت خود مجھے تخلیقی ہنر حاصل ہونے لگتا ہے.....

برادر عزیز، ادب کے معاملے میں اب میں وہی نہیں ہوں جو دو برس پہلے تھا..... دو برس کے مطالعے نے بہت کچھ مجھے بخشا اور بہت کچھ لے بھی لیا......

ابھی ایک مضمون پڑھا ہے، ان جرمن شاعروں کے بارے میں، جو سردی اور بھوک سے مر گئے یا پاگل خانے میں دم توڑ گئے۔ کوئی بیس کے قریب تھے..... ابھی تک مجھ پر

دہشت طاری ہے.....

(بھائی میخائیل کے نام ۲۴ مارچ ۱۸۴۵ء کے خط سے)

ناول (دراصل ناولٹ) مئی کے شروع میں صاف ہوا۔ قریب ترین اہلِ قلم گری گورووچ کو پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ وہ جھوم اُٹھا؛ لیے ہوئے وقت کے نہایت ہونہار اور مقبول عام شاعر نکراسوف کے پاس پہنچا۔ سماور سُلگایا گیا۔ چائے گرم ہوتی رہی، ناول پڑھا جاتا رہا۔ صبح کے چار بجے کے قریب، جب ملگجا سا اُجالا ہونے لگا، دونوں بے اختیار اُٹھے اور دستوئیفسکی کے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجادی۔ اس رات فیودر دستوئیفسکی سویا نہیں تھا۔ گھبرا کر دروازہ کھولا اور اپنی پہلوٹی کی تصنیف پر صبح کا اُجالا ہوتے دیکھا۔ دونوں قلم کار اسے گلے لگا کر منہ چوم رہے تھے اور داد دیے جا رہے تھے۔

یہ اس کی زندگی کا پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ تھا جسے ایک زمانے تک مختلف موقعوں پر دُہراتا رہا۔ اس واقعہ کو دستوئیفسکی نے خوب چٹخارے لے لے کر لکھا ہے۔

نکراسوف نے جو ایک سال نامہ ("المناخ") نکالتا تھا، اسی دن وہ مسودہ ادب کے صاحب نظر مفتیِ اعظم بے لینسکی کو دیا (جو رسالے کا اصل اڈیٹر تھا)۔ کہا کہ نیا گوگول پیدا ہو گیا ــــ بلکہ گوگول کیا، بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ بے لینسکی نے اپنے کچے رفیق کے کہنے کا اعتبار نہ کیا۔ اور جب تین چار دن بعد مسودہ اٹھا کر ورق اُلٹے پلٹے تو پھر ختم کیے بغیر کتاب ہاتھ سے نہ رکھی گئی۔ مصنف کو بلاوا آیا۔ مغربی ادب اور حقیقت پسندی کے معیار کا جیتا جاگتا دیوتا ــــ بے لینسکی اور اس کے ہم خیال کئی اہلِ قلم موجود تھے۔ انھوں نے ناولٹ کے اصل کرداروں کے چناؤ، دردمندانہ برتاؤ اور گہری نظر پر وہ داد دی جو مصنف کے خواب و خیال میں نہ تھی:

"صاحب زادے، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ جانو، تمھارے قلم سے کیا بڑی [معجوبا] چیز نکل گئی ہے"۔ طے ہوا کہ اِسے دھوم دھام سے "المناخ" میں چھاپا جائے۔ سال نامہ تو اگلے سال نکلا، ناولٹ کی دھوم پہلے ہی ہو گئی اور اسی کے ساتھ مصنف کو کامیابی کا نشہ چڑھا۔ قدم بہکنے لگے تو ہم چشموں کو پھبتیاں سوجھیں۔ خصوصاً تورگنیف، جو مغربی ذوق کے جدت پسندوں میں قدم رکھتا تھا اور رئیسانہ شان سے، بنا سنورا، اونچی محفلوں میں توجہ طلب رہا کرتا تھا، اس "پھیپھڑ" لڑکے پر چھینٹے اُڑانے لگا، جو اپنے آپ کو سنبھالنے سے معذور رہتا۔ ستوا مصرعوں کی پھبتی مشہور ہوئی۔ جس کے دو مصرعے یوں ہیں:

واہ رے، فیدے (F.D.) تیرا ٹھٹّا
رُوئے ادب پر پکّا ٹھپّا

بلکہ یہاں تک افواہ اُڑائی گئی کہ دستوئیفسکی نے اڈیٹروں سے کہہ دیا ہے کہ میرا ناولٹ خاص اہتمام سے چھاپا جائے۔ ہر صفحہ خاص حاشیے سے سجایا جائے۔ ہنسی میں لپٹی ہوئی یہ ایسی گولی تھی جو ٹھیک نشانے پر لگی اور عمر کے آخری مرحلے تک دستوئیفسکی اس افواہ کو رد کرتا رہا۔ یہاں تک جب اس نے جوانا مرگ بے لنسکی سے اپنے اختلافات اور بے تعلقی کا تذکرہ لکھا، تب بھی اس بوسیدہ افواہ سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ (۱)

پتھریلی سڑکوں، بلند عمارتوں اور بدرنگ دیواروں میں پلے ہوئے نوجوان مگر بدوضع، اکھڑ اور زود رنج دستوئیفسکی کو اوپر کے حلقوں میں جو شہرت ملنی شروع ہوئی اس کی بدولت روشن خیال بلکہ ریڈیکل لوگوں سے میل جول بڑھا، اور ساتھ ہی ادب نواز رئیسوں کے دیوان خانے، ہفتہ کی شام کے ادبی جلسے اور نرم، دل نواز لب ولہجہ والوں کے ڈرائنگ روم اس پر کھل گئے۔ ہم چشم اہلِ قلم سے زیادہ یہاں اس کی پذیرائی ہونے لگی۔ وہ پائے تخت کے مفلس کلرکوں "آشفتہ مو، آشفتہ خو نوجوانوں" اور فاقہ مست قلم مزدوروں کے علاوہ اِرسٹوکریسی کے ماحول سے بھی آشنا ہو چلا۔ ناول 'بے چارے لوگ' ("بیدنی یے لوُدی")، پر بے لنسکی اور اس کے روشن خیال، جمہوریت پسند بلکہ انقلاب پسند حلقے نے جتنی کچھ داد دی، وہ نوعمر مصنف کے آرٹ پر کم اور اس کی سماجی حقیقت پسندی پر زیادہ مبنی تھی؛

> حقیقت نے تمھیں، فن کار کو، اپنا رُوپ دکھا دیا، تمھیں غیب سے ایک تحفہ ہاتھ آگیا ہے؛ اس تحفے کی قدر کرنا سیکھو۔ اس سے وفا کرو تو تم ایک نہ ایک دن بڑے آرٹسٹ بن جاؤ گے۔

ہر طرف صدا اُٹھی کہ گوگول ثانی پیدا ہو گیا۔ اور گوگول بھی اس کے سامنے کیا! دستوئیفسکی کے پاؤں زمین

---

(۱) "بیدنی یے لوُدی" کا سب سے پہلا مطبوعہ نسخہ نظر سے گزرا تو پتہ چلا کہ واقعی اس کے گرد پھولدار حاشیہ کا حصار چھپا ہوا ہے۔ دستوئیفسکی کا یہ پہلا ناول تھا جس کا ترجمہ براہِ راست روسی زبان سے کیا گیا۔ یہ اور اس کے بعد کا ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" "جواری" "چچا کا خواب" "اِڈیٹ" وغیرہ بھی ماسکو کے پروگریس پبلشرز سے نکل چکے ہیں۔ اور سبھی میرا ترجمہ ہیں۔ البتہ ناول "جرم و سزا" جو دہلی سے نکلا، مظہرالحق علوی کا اور "جواری" جو لاہور سے شائع ہوا، قاسم محمود نے انگریزی سے کیا ہے۔ آخری شاہکار ناول "برادران کرامازوف" ابھی تک اُردو میں نہیں آیا۔ ظ ا۔

پر نہیں پڑتے تھے۔ عادتوں میں توازن کی کمی کے کارن وہ کڑی کمان کا تیر بن گیا۔ بات بات پر تلخ جملے کستا، کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ اوروں کے حملے اور جملہ بازی سے بچنے کے لئے خود ہی دوسروں کو نشانہ بنانے لگا۔ اور ہم عصر اس سے چڑ گئے۔ ۱۵ر جنوری ۱۸۴۶ء کو یہ مختصر سا ناول نخرا سوف کے سال نامے میں نکلا اور چند ہفتے بعد کڑدرے کسیلے تبصرے سامنے آنے لگے ...... "مجھ پر کیا کیا حملے ہو رہے ہیں۔ گوگول اور توپشکن پر شروع میں کیا کچھ نہیں گزری ... " پبلک بھی دیوانی ہے۔ پڑھنے والوں میں پچتر فی صد میرے نام پر کالک پوت رہے ہیں، صرف ایک چوتھائی (بلکہ اس سے بھی کم) جنھوں نے خوب جی کھول کر داد دی ہے ... " ابھی یہ پہلا ناول چھپا نہ تھا کہ اس نے دوسرے ناول کو آگے بڑھا لیا: "ڈبل" کے عنوان سے ایک کردار کے اندر اہرمن و یزداں، خیر و شر، نفی و اثبات، خلوص اور مکر کی ایک جا لپٹی ہوئی اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی شخصیت اس نے دکھانی چاہی، وہ مصنّف کے خیال میں ایک شاہکار ناول بننے والی تھی۔ اِس کردار کا نام ہے گلیادکن۔ ایک بیچ بیچ کا مجہول سا آدمی، دوسرا اس کی تمناؤں کا پیکر ـــــ اصلی گلیادِکن اور اس کا توڑ فرضی گلیادِکن ـــــ جو اصلی کو میدان سے بھگا دیتا ہے۔ "میرا یہ گلیادِکن 'بے چارے لوگ' سے دس گنا بہتر نکلے گا۔"

مگر نکلا بدتر۔ خیال یقیناً اچھوتا تھا، مگر موضوع سے مصنّف کا برتاؤ، جملوں کا تال میل، استعارے، محاورے سبھی گوگول کی نقل نظر آنے لگے، پڑھنے والوں نے منھ بنایا۔ داد نہ ملی۔ لگے ہاتھوں اس نے دو ناولٹ اور لکھے۔ ایک مکھی چوس" پروخارچن " کی کہانی اور " نو خطوں میں پورا ناول" (جو رات بھر میں لکھا گیا تھا) یہ بھی پٹ گئے۔ جس رفتار سے پارہ چڑھا تھا، اسی رفتار سے سال بھر کے اندر اُتر بھی گیا۔ ایک تو سماجی حقیقت پسندی سے منھ پھیر لینے کا الزام اور پھر دستوئیفسکی کے افسانے اتنے عام ہوئے کہ کل تک کے رفیق آج کے رقیب بن گئے۔ خود بے لینسکی اتنا چڑ گیا کہ نخرا سوف کے ساتھ بیٹھا تاش کھیلتا رہا اور مصنف کو منھ تک نہ لگایا۔ ہم چشم مختلف صحبتوں میں اس کے چٹکیاں بھرنے لگے۔ لیکن ایک بار اسے انسانی شخصیت کے باطنی تضاد میں، نفسیاتی کش مکش میں اُترنے کا چسکا لگ گیا تو پھر اُس نے فن کارانہ مطالعے کے لئے اسی گہرے کنویں کو چُنا۔ ناولٹ "ڈبل" کے بعد دوسرا، مالکہ مکان ("خزائیکا") اور "نے تچکا نزوانووا" بُرے ماحول میں پلی ہوئی نیک دل لڑکی کا افسانہ ہے۔ یہاں پھر نفسیات کی تہیں کھولنے اور تضادوں کو بے نقاب کرنے کی لگن ہے۔ گلیادکن کی طرح یہ نوخیز لڑکی بھی مصنف کا ایک اعتراف ہے۔ باپ سے نفرت اور محبت کی دوہری تہوں میں دستوئیفسکی گویا اپنا سینہ شق کر کے دکھا رہا ہے۔ "مالکہ مکان"

اور "نے تھکا" دونوں کے بعد دیگرے لکھے ہوئے ناولوں میں محبت اور نفرت کے تار ایک دوسرے میں بٹے ہوئے، مضبوط ڈور کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔

اُن دنوں روس میں افسانوں اور ناولوں کی، اور ساتھ ہی شاعری کے مقابلے میں نثری تصانیف کی، رسالوں اور اشاعت گھروں کی گرم بازاری ہوچلی تھی۔ نکراسوف گروپ نے پوشکن کا جاری کیا ہوا ماہ نامہ معاصر ("سوورمینیک") خرید لیا۔ یہ گروپ دستوئیفسکی سے اس کے فنّی موڑ سے بدظن ہوا تو اس کے حریفوں نے اِدھر کا رُخ کیا۔ حریفوں میں جو عمر بھر کے لئے حلیف بنے، ایک خوش حال شاعر اور بعد میں پبلشر ایوتون مائیکوف تھا، دوسرا ڈاکٹر یانوفسکی۔

..."معاصر" والے خفا ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے کرائیفسکی سے چاندی کے ہزار روبل ایڈوانس مل جائے گا۔ پبلشر مخالفین کی ترکیبوں سے گھبرایا ہوا ہے۔ ہر ایک شرط منظور کرے گا... تم ۲۰ دن کی چھٹی لے کر آجاؤ۔ پہلے وہاں پیٹرسبورگ میں ایک شخص تھا قرآن نام کا۔ صرف ترجمے سے بیس ہزار روبل سالانہ کمالیتا تھا۔ تم ایک سال کام کرو تو کامیاب ہوجاؤ گے۔ ادبی حیثیت بنے گی۔ آج کل جسے دیکھو وہ ترجمہ پر ترجمہ کئے جارہا ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔

(بھائی کے نام اپریل ۱۸۴۷ء)

یہ وقت خود دستوئیفسکی پر ذہری بے چینی کے ساتھ گزر رہا ہے۔ اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ راتوں کو اٹھتا ہے، اپنے خیالات ٹٹولتا ہے: مغربی طرز کی جمہوریت، ریڈیکل ازم، یا ناخواندہ ورق، فردِ واحد کی اندرونی کائنات کی سیر، اس کا تجزیہ؟ جنون کی سی کیفیت نے رنگ پکڑا، بار بار گھر بدلنے لگا۔ کرائے کے مکان چھانٹنے کے لئے گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔ ایک نوعمر حسینہ سے کسی محفل میں آمنا سامنا ہوا تو وہیں چکرا کر گر پڑا۔ طبیعت میں آشفتگی اتنی بڑھی کہ مرگی کا دوسرا یا تیسرا دورہ پڑا اور ڈاکٹر یانوفسکی اسے گاڑی میں ڈال کر گھر لے گیا۔ فصد کھولی تو روشنائی کے رنگ کا گاڑھا سیاہی مائل لہو ٹپکتا رہا۔ یہی سیاہی تھی، یہی بعد کی روشنائی۔

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار....

نئے سیاسی شعور نے طالب علموں، چھوٹی حیثیت کے سرکاری ملازموں، دکان داروں، ادیبوں اور صحافیوں میں یہ لہر دوڑا دی تھی کہ جامد اور ظالم زار شاہی کے خلاف بغاوت کے لئے خفیہ سازشی گروہ

کا ہونا لازم ہے ــــــ اور کامیابی کے لئے گروہ مد گروہ تیاری۔
کچھ ہوشمند لوگ سرفروشی کی خاطر، اور کچھ ان کی نقالی میں فیشن کے طور پر انقلابی رُوپ دھارنے لگے۔ وزارتِ خارجہ کا ایک عہدہ دار، بظاہر قلندر، مگر دل سے رکھ رکھاؤ کا شوقین میخائیل پترا شیفسکی بھی ان میں سے ایک تھا جس نے پکروف اسٹریٹ پر اپنے مکان پر جمعہ کی محفل جمانی شروع کی۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ فرانسیسی سوشلسٹ ساں سائمن اور فوریے (Fourier) کے خیالات، اخبارات اور غیر قانونی لٹریچر پر تبادلۂ خیال کی بے ضابطہ محفل ہوتی تھی۔ یار دوست آتے، بڑے سے کمرے میں بکھری ہوئی کرسیوں اور اکلوتے صوفے پر دراز ہو جاتے، درمیان میں ایک شمع ٹمٹمایا کرتی۔ اور اس کے گرد سگرٹ کا دھواں، روس بلکہ دنیا کے مستقبل کی روشنی تلاش کرنے میں آرام دہ صوفوں، قالینوں اور تیز روشنیوں سے "پرہیز" تو کرنا ہی تھا۔ چائے کے دور چلتے، تاش پھینٹے جاتے اور اسی روا روی میں مذہب، خدا، خاندان، شاہی خاندان، فرانس، ادبی رفتار، بے لنسکی کی تنقید، ادبیات، تھیٹر سبھی موضوع زیرِ بحث آتے۔ کبھی کبھی کوئی خلاف قانون تحریر پڑھ کر سنائی جاتی۔ نرم گرم ہر طرح کے آزاد خیال لوگ تھے۔ جو جی میں آتا، کہہ گزرتے اور چوں کہ ظاہری غیر رسمی سا مجمع ہوتا، سب ایک دوسرے کے واقف کار، اس لئے احتیاط اور پردہ داری کی بھی خاص ضرورت نہ تھی۔
نیا دوست [غنائی شاعر] اپولون مائیکوف اس "جمعہ برادری" سے واقف تھا، ہمدردی کے مارے وہ دستوئیفسکی کو بھی ایک دن وہیں لئے ہوئے پہنچا تاکہ روشن خیال جوانوں سے ملنے ملانے میں اس کی مُردار تنہائی اور بے دلی دور ہو سکے [قطعی غیر سیاسی ذہن کے] بڑے بھائی میخائیل کو بھی ساتھ لے لیا، جو بھائی کے کہنے سننے سے نوکری چھوڑ کر پیٹرسبورگ "ادبی خدمت کی خاطر" رہنے چلا آیا تھا۔ ہر جمعہ کو آمد و رفت شروع ہوئی۔ ذہن کو خوراک ملی اور تنہائی کو رفیق۔ دستوئیفسکی میں نئی نیم سیاسی زندگی کے آثار جاگنے لگے۔ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال کھنچ گیا (۱۸۴۷ء۔ ۴۸) اسی دوران اس نے لکھا بھی تیز رفتاری سے "ایماندار چور" "نازک دل" اور "سفید راتیں"، طویل افسانے انہی دنوں کے لکھے ہوئے ہیں)۔
۱۸۴۸ء میں پورے مغربی یورپ (خصوصاً جرمنی، بلجیم، آسٹریا اور فرانس) میں انقلاب اور خانہ جنگی کی لہر اٹھی تو روس کی زار شاہی بہت چراغ پا ہوئی۔ پولیس کی نگرانی، چھاپے، سنسر، بندشیں، معمولی سے شبہ پر گرفتاریاں۔ پترا شیفسکی والوں کے پول میں اطالوی نسل کے ایک مخبر انتونے کو دھانس دیا گیا جو مسکین صورت کے ساتھ گرماگرم باتیں بنایا کرتا تھا۔ ایسے وقت میں جب "سرفدم"، رعایا (بے زبان کسان رعایا،

جسے خریدا بیچا جاتا تھا) میں جاگیرداروں کے خلاف اُبال آیا تھا۔ مخبر کی رپورٹوں نے وزارت داخلہ کو اس بے ضرر جمعہ برادری سے چوکنا کر دیا۔ ابھی کچھ نہ بگڑتا، لیکن حلقے میں پترا شیفسکی سے اختلاف کرتے ہوئے دو تیز نوجوان نمودار ہوئے۔ ایک لامذہبا جابرانہ طبیعت کا، رعب داب والا اسپش نیف، جس نے صاف کہہ دیا کہ موجودہ زار شاہی کا تختہ اُلٹنے کی خاطر ہر قسم کی عملی کارروائی، مظاہرے، سازش، بغاوت اور سیاسی قتل نہ صرف جائز بلکہ لازم ہوں گے۔ عملی نوجوانوں کا گروپ اُس کے ساتھ ہو لیا۔

دوسرا سرگے ئی دوروف؛ عمر میں فیودر سے پانچ سال چھوٹا، خیالات میں گہرا، تنک مزاج، تصوف پسند شاعر جو ایمان رکھتا تھا کہ سچی مسیحیت اور سچے سوشلزم کا منشا مطلب ایک ہی ہے۔ تصوف پسند مصنف اس گروپ سے مل گیا۔ مگر اسپش نیف کے اثر میں رہا (پانچ سو روبل قرض لینے کے بعد وہ یوں بھی اس کے دباؤ میں تھا) طے پایا کہ ایک خفیہ پرنٹنگ پریس قائم کیا جائے جہاں سے غیر قانونی لٹریچر چھاپ کر تقسیم ہو۔ یہ فریضہ بیار د نزار دستوئیفسکی کے سپرد ہوا اور اس نے نہایت احتیاط اور سرگرمی سے انجام دیا۔ ایک ہم خیال کے مکان میں پریس لگ گیا۔

مارچ (۱۸۴۹ء) کی ایک شام جب دستوئیفسکی دوروف سے ملنے گیا، وہاں بے لنسکی کے اس مشہور خط کی نقل اسے دی گئی جو بے رحم نقاد نے اپنے پرانے چہیتے گوگول کو، اس کی تبدیلیِ خیالات پر ڈانٹ کر لکھا تھا کہ تم جیسا حقیقت پسندیوں روسی کلیسا کے دامن میں پناہ لے۔ شرم کی بات ہے۔!

اس خط سے، چوں کہ صرف تین بڑوں، گوگول، بے لنسکی اور دستوئیفسکی کا ہی تعلق نہیں، بلکہ سب کے دانش وروں اور فن کاروں کی ذہنی ہلچل کا بھی سراغ ملتا ہے، اس نے بڑی شہرت پائی اور بالآخر تاریخِ ادب کا حصہ بن گیا۔ (۱) سبب کا اندازہ اقتباس سے ہو جائے گا:

..... کلیسا (یعنی نظام) نے ہمیشہ کوڑے ([illegible] K) کا ساتھ دیا اور جابرانہ طاقت کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر تم مسیح کو اس سے کیوں جوڑتے ہو؟ (۲) کسی بھی کلیسا سے، خصوصاً [ہمارے یہاں کی]

---

(۱) بے لنسکی کے مجموعہ مضامین (مطبوعہ ماسکو، روسی و انگریزی) میں شامل ہے۔

(۲) دراصل یہ کہ حضرت مسیح کو خود بے لنسکی خواہ مخواہ کا ایک زبردست مقرر شمار کرتا تھا جو اپنی زندگی میں ناکام رہا۔

پر ادو سلاف سیحیت سے مسیح کا کیا واسطہ! یسوع مسیح پہلا شخص تھا جس نے آزادی، مساوات اور اخوّت (بھائی چارے) کا نعرہ بلند کیا.... لیکن کلیسائی نظام نابرابری کا حامی، اہلِ اقتدار کا خوشامدی اور انسانی اخوت کا دشمن رہا ہے.... جس خاکساری یا تسلیم و رضا کی تم تبلیغ کرنے چلے ہو، وہ ایک تو انتہائی خود فریبی کی علامت ہے، دوسری طرف انسانی وقار کو مٹی میں ملانے کی شرم ناک حرکت ..... "ہمارے اہلِ کلیسا کو دیکھو، زیادہ تر لفاظ، فقہ کے کٹر ہٹ دھرمی اور بے دردی کی حد تک بداخلاق پاؤ گے ......

اگلے جمعہ کی نشست میں یہ خط حاضرین کو پڑھ کر سنانا تھا اور اس فن میں دستوئیفسکی ممتاز ہو چکا تھا۔ دوسری نشست میں گری گوریئیف کی "فوجی جوان کی کہانی"۔ بھی اسی کو پڑھنی اور آواز بلند سنانی پڑی۔ کہانی حکومت اور اس کی فوجی مشین کے خلاف تھی۔

پرچہ لگا۔ بادشاہ سلامت کو رپورٹ گزری۔ حاشیے پر انھوں نے نوٹ لکھا: اگر یہ محض لفظی تفریح ہو تب بھی مجرمانہ اور ناقابلِ برداشت ہے۔ انھیں گرفتار کیا جائے ..... خدا کا نام لے کر ان پر ہاتھ ڈالا جائے اور رضائے الٰہی کی تعمیل ہو۔"

۲۲؍ اپریل (۱۸۴۹ء) جمعہ کی شام کو دستوئیفسکی وہیں پیترا شیفسکی کے ہاں گیا تھا۔ غیر قانونی اخبار نکالنے کی تیاریوں پر گفتگو چلتی رہی۔ آدھی رات کو بھیگا اور کانپتا ہوا گھر آیا۔ آنکھ لگ گئی۔ اور گھنٹہ بھر بعد (چار بجے صبح) دروازے پر گھونسوں کی آواز نے اسے جگا دیا، "پکڑ لو، دروازہ کھولو۔ سرکاری حکم"۔ گھر کی زبردست تلاشی ہوئی۔ چھوٹا اور نہایت بے قصور بھائی آندرئے بھی گرفتار ہوا۔ پولیس حوالات میں لائے تو دیکھا کہ پیترا شیفسکی اور اسپش نیف پہلے سے موجود تھے۔ خاص خاص ملزموں کو پیتر پاول فسک (پرانے) قلعے کے حوالات میں لے جا کر ڈال دیا گیا۔ یہ بڑی جان لیوا قید تھی: "میعادِ قید لامعلوم۔" باہر کی دنیا سے قطعی بے تعلقی۔ نہ خط نہ ملاقات۔ کوئی نظر بند پاگل ہوا، کسی نے خودکشی کرنی چاہی، کوئی یادداشت کھو بیٹھا۔ کسی کو عمر بھر کے لئے بے خوابی کا مرض لگ گیا۔ دستوئیفسکی یوں ہی کمزور، لاغر اور چڑچڑا تھا، پہلے ڈھائی مہینے بھاری پڑے۔ آندرئے کو رہائی ملی تو بڑا بھائی میخائیل پکڑ لایا گیا۔ پھر وہ بھی رہا ہوا تو دستوئیفسکی نے اس جبری تنہائی کو غنیمت جانا۔ خط آنے جانے لگے۔ کتابیں منگوانے کی اجازت مل گئی، قلم کاغذ آ گیا —— تو اس نے بھائی کو لکھا (۱۸؍ جولائی ۱۸۴۹ء)

..... تم لکھتے ہو کہ ہمت سے کام لوں۔ تو میں نے کب ہمت سے کام نہیں لیا۔ ایک مریضانہ اُکتاہٹ ہوتی ہے، سو اس کا کیا علاج! بلکہ سچ پوچھو تو ایسی اُکتاہٹ بھی نہیں۔ عموماً میرا وقت غیر معمولی ناہمواری سے بسر ہو رہا ہے۔ کبھی بہت تیز رفتار،

کبھی بالکل اُونگھتا ہوا۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ آدمی اس وضع کی زندگی کا عادی ہے تو پھر ناگوار نہیں گزرتا۔ آج کل موسم صاف اور خوش گوار ہو رہا ہے تو جی لگتا ہے۔ موسم خراب ہو جائے تو طبیعت مکدر ہوتی ہے اور کوٹھری ہیبت ناک نظر آنے لگتی ہے۔ مگر میں نے اپنے لئے مشغلہ نکال لیا ہے۔ تین بڑی کہانیوں اور دو ناولوں کا ڈول ڈالا ہے۔ ایک تو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ البتہ زیادہ محنت نہیں ہونے پاتی ......

صحت ان دنوں اچھی ہے، بس ذرا گلے میں تکلیف رہتی ہے اور اعصاب میں اینٹھن۔ باہر تھا تو لکھتے لکھتے توجہ ہٹا کر اِدھر اُدھر جی بہلا لیا کرتا تھا۔ مگر یہاں، لکھنے کے کام سے جو اعصاب پر تناؤ سوار ہو جاتا ہے، اُسے خود ہی اُترنا چاہیئے، اُتارنے کی کوئی اور سبیل نہیں۔ پانچ گھنٹے روز سوتا ہوں اور رات میں چار پانچ بار نیند اُچٹتی ہے۔ شام کا اندھیرا نو بجے سے جھانکنے لگتا ہے تو گھبراہٹ ہوتی ہے اور ایک دو بجے تک آنکھ نہیں لگتی۔ بس یہی ہے جو سخت گراں گزرتا ہے.....

ایک مہینے بعد اسی میخائیل کو صحت بگڑنے کی خبر دیتے ہوئے لکھتا ہے:

.... مہینے بھر سے کاسٹر آئل (ارنڈی کے تیل) پر بسر ہو رہی ہے۔ سینے میں درد رہنے لگا ہے۔ رات کو بُرے بُرے خواب آتے ہیں۔ طرّہ یہ کہ کوٹھری کا فرش ہلتا اور سانس لیتا ہوا لگتا ہے۔ جیسے پانی کے جہاز کی کیبن ہو۔ اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ پہلے ایسا ہوا کرتا تھا تو میں خود کو لکھنے میں لگا دیتا تھا۔ ایسی حالت میں لکھا خوب جاتا تھا۔ مگر اب ایسا کروں، اپنے آپ کو نہ روکوں تو مر ہی جاؤں۔ تین ہفتے سے کچھ نہیں لکھا۔ (۲۷ اگست ۱۸۴۹ء)

اس پر بھی تازہ رسالوں، کتابوں کی طلب تیز ہے:

مجھے باغ میں ٹہلنے کی اجازت مل گئی۔ باغ میں سترہ درخت ہیں۔ شام کو شمع روشن کرنے کی اجازت بھی ملی ہے۔ دونوں خوشی کی باتیں۔ تیسری یہ ہوگی کہ تم مجھے فلاں فلاں رسالہ، تاریخ کی کتابیں، عتیق اور جدید عہد نامہ (انجیل کے دونوں حصے) بھجوا دو۔ فرنچ ترجمہ ہو تو بہتر.....

اگرچہ معدے کی خرابی، موسم خزاں کی بھاری مرطوب ہوا، اور اکیلی کوٹھری میں جو چوبیس گھنٹے میں صرف پانچ دفعہ کھولی جاتی تھی، اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ تاہم جیسا کہ اس نے لکھا تھا:

".....یوں کبھی نہ مانتا لیکن تجربے نے مجھے یقین دلا دیا کہ انسانی فطرت میں حیرت انگیز دم خم ہے"۔ اس حالت میں حیرت انگیز دم خم سے کام لیا، کوٹھری کی دیوار پر انگلیاں بجا کر ہمسایہ قیدی فلی پوف سے ٹیلی گرافک بات چیت کر لیتا۔ رات کو شمع جلا کر کاغذ رنگ لیتا۔
"چھوٹا سا ہیرو" طویل افسانہ یونہی لکھا گیا جو قبل از وقت جنسی شعور حاصل کرنے والے لڑکے کی شاعرانہ اور جذباتی دنیا کا بیان ہے۔

۲۸ نظر بندوں کی عدالتی تفتیش پانچ مہینے چلتی رہی۔ پھر الگ الگ سوال جواب کے لئے طلبی ہوئی۔ دستوئیفسکی پر الزام تھا کہ زار سرکار کی مخالف انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتا، مشتبہ لوگوں سے رابطہ رکھتا اور گوگول کے نام بے لینسکی کا وہ خط بھرے مجمع کو پڑھ کر سنایا جس میں حکومت اور مذہب کے ذمہ داروں کی توہین بھری تھی۔

"دیکھو، سچ سچ سب بتا دو، شہنشاہ معظم تمھارا قصور معاف کر دیں گے"، انکوائری کمیشن کے ممبر نے اسے پھسلایا، مگر وہ اکڑا رہا۔ اوّل تو زبان نہیں کھولی اور پھر بولا تو جوابی حملے کے انداز میں "اگر کسی نے اس کے بالکل ہی نجی خیالات کریدے جائیں، کسی نے اپنے ساتھیوں کی چھوٹی سی ٹکڑی میں کس وقت کیا کہہ دیا تھا، اگر اس پر جواب طلب کیا جائے تو کون ہے جو مجرم نہیں ٹھہرے گا؟"

سول کورٹ سے مقدمہ فوجی عدالت میں گیا۔ آخر آٹھ مہینے کی دوہری عدالتی کارروائی کے بعد ۱۶ ر نومبر (۱۸۴۹ء) کو فیصلہ سنا دیا گیا۔

ساٹھ ملزموں کو عمر قید، جلاوطنی،
پندرہ کو سزائے موت (چوک میں گولی مار کر)،
چھ نوجوان بری۔

لیکن یہ فیصلہ آڈیٹر جنرل کو نظر ثانی کے لئے بھیجا گیا تو وہاں سے دو کے سوا باقی سبھی ملزموں کو سزائے موت کا فیصلہ اور اسی کے ساتھ شہنشاہ سے رحم کی، موت کو قید با مشقت میں تبدیل کرنے کی سفارش لکھی آئی۔ آقائے نامدار نے چند ترمیموں کے ساتھ دستخط ثبت فرما دیے، لیکن اصل فیصلہ ڈرامائی کرتب دکھانے تک محفوظ رکھا۔ زندگی اور موت کے درمیان کچے دھاگے میں لٹکے ہوئے چند لمحوں کی حالت دستوئیفسکی سے بہتر کون بتا سکتا ہے۔ ہم اسی کے ایک خط کا خلاصہ کیے دیتے ہیں:

"آج ۲۲ ر دسمبر کو ہمیں سیمیونفسکی چوک پر لے گئے۔ (۱) جس بند گاڑی میں ہمیں

---

(۱) اس دن صبح ۶ بجے، منہ اندھیرے اٹھا کر آٹھ مہینے پہلے کے ذاتی کپڑے دیئے گئے تاکہ قیدی سردی سے نہ مر جائے۔

گولی مارنے لئے جا رہے تھے، اس کی کھڑکیوں سے جھانک کر میں نے بہت سارے لوگوں کو دیکھا (۱) وہاں پہنچ کر ہمیں چومنے کے لئے صلیب دی گئی، تلواریں ہمارے سروں پر توڑی گئیں اور آخری پوشاک یعنی سفید قمیص پہننے کو ملی۔ پھر تین تین کی قطاروں میں باندھ دیا۔ میں چھٹا تھا۔ دوسرے ہمبر پر پکارا جاتا۔ بس موت میں ایک منٹ کا وقفہ رہ گیا تھا۔ اس آخری لمحے صرف تم اور تمھارے گھر والے یاد آئے۔ اوہ، بھائی کی یہ محبت آلشِ پچے یف اور دوُرف، دونوں میرے داہنے بائیں بندھے کھڑے تھے۔ ان کو گلے لگایا۔ خدا حافظ کہا۔ اتنے میں بینڈ بجا اور شاہی فرمان پڑھ کر سنایا جانے لگا (۲) ہنیش بار وہی الفاظ۔ اکیلے پام کو معافی ملی۔ باقی کو مختلف سزائیں۔ مجھے چار سال قید بامشقت (سائبیریا میں) اور پھر فوج کی معمولی ملازمت۔ آج یا کل ہمیں روانہ کر دیا جائے گا۔ تم سے ملنے کی درخواست کی تھی، اجازت نہ ملی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری ہے، زندگی تو ہر مقام پر زندگی ہے۔ ہمارے باہر کی دنیا میں نہیں، ہمارے اندر ہی آباد ہے زندگی۔ میرے آس پاس لوگ ہوں گے۔ آدمیوں کے درمیان آدمی رہنا، ہمیشہ خود کو سنبھالے رکھنا، کسی بھی کٹھن وقت میں ثابت قدم رہنا، یہی زندگی ہے، زندگی کا اصل مفہوم، یہ خیال میرے رگ و پے میں سما گیا ہے۔

مسودوں کے ورق مجھ سے رکھوا لئے گئے ہیں۔ اوورکوٹ اور پرانے کپڑے خود چھوڑے جا رہا ہوں منگوا لینا۔ مجھے اب اس لمبے سفر میں، ہوا سے بھی زیادہ نقد روپے کی ضرورت پڑے گی۔ کہیں سے کچھ انتظام کرنا۔'

---

(۱) یہ بند گاڑی جس میں سزائے موت کی جانب الگ الگ قیدی کو لے جاتے تھے، وہی تھی جو نوجوان رقاصائیں تھیٹر جاتے وقت استعمال کرتی تھیں

(۲) ہر ایک کا نام، مقام وغیرہ پکارا جاتا اور ہر بار آخر میں سنایا جاتا کہ "سزا۔ گولی مار کر ہلاک کرنا"۔ سزا کا رسمی فیصلہ سنانے والا ہکلا بھی رہا تھا۔ اٹک اٹک کر فرمان پڑھتا۔ صلیب کو تو سب قیدیوں نے بوسہ دیا۔ آخری وقت کا توبہ و استغفار صرف ایک نے کیا۔ کپڑے اتروا لئے گئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی۔ صفر سے ۲۲ ڈگری نیچے کڑاکے کی سردی میں کمزور قیدیوں کا قتل گاہ کے تختے پر کوئی پچیس منٹ تک لمبے کرتے میں کھڑے رہنا قیامت تھا۔ سزائے موت معاف ہوئی لیکن زندگی خود سزا بن گئی۔ کسی کو ذہنی سکون ہمیشہ کے لئے ہوا س کھو بیٹھا۔ کسی کی ناک گئی۔ کسی کے کان کو پالا مار گیا۔ ایک کے پھیپھڑے بے کار ہو گئے اور تپ دق سے مرا۔ وہ آدھا گھنٹہ جیتے جی سزا کا نشان چھوڑ گیا۔

روحانی زندگی کا ایسا زبردست چشمہ میرے اندر پھوٹ پڑا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ کیا خبر، جسم اس کا بوجھ اٹھا بھی سکے یا نہیں۔ زندگی میں اتنے دکھ اٹھا چکا ہوں کہ اب کوئی مصیبت مجھے ڈرا نہیں سکتی۔ اپنے دل و دماغ کے ساتھ کتنا ظلم کر چکا ہوں۔ کتنے گناہ سرزد ہوئے کتنا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ زندگی جیسے قیمتی تحفے اور مسرت کے خزانے کی قدر نہ جانی۔ اب جب کہ زندگی نے چولا بدلا ہے تو میں پھر سے نئے سانچے میں جنم لے رہا ہوں۔ اب ایک ہی اُمید ہے، ایک ہی تشفی کی صورت ہے کہ جو نیا جنم ملے، وہ بہتر چیزوں کے کام آئے۔

نوٹ: دو کتابیں روک لی گئی ہیں (سوشلزم خیالات کی تھیں) ایک کتاب ایو گنے ینا پترووِنا سے مانگی ہوئی تھی۔ پولیس والوں سے واپس لے کر اس خاتون کی امانت اسے پہنچا دینا متعلق افسر کو اس لیڈی کا پتہ دیا ہے، ذرا معلوم کرنا اس نے پہنچا دی یا نہیں ....

کرسمس کے تیوہار کی بدولت دستوئیفسکی اور دورف کو رخصت سے پہلے آدھ گھنٹے کو بھائی کے گلے لگنے کی اجازت مل گئی۔

میلیوکوف، جس نے اجازت حاصل کی تھی، لکھتا ہے کہ کوئی خدا حافظ کہتے وقت دونوں بھائیوں کو دیکھتا کہ سائبریا کو روانہ ہونے والے سے زیادہ وہ زخمی ہے جو یہاں پائے تخت میں رہنے والا ہے۔ دستوئیفسکی کے ہونٹ کانپ رہے تھے، آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ بڑے بھائی کو سمجھا رہا تھا کہ میں قبر میں نہیں جا رہا ہوں، تم میرا جنازہ نہیں اُٹھا رہے ہو۔ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ وہاں جیل خانے میں بھی آخر درندے تو نہیں، آدمی ہی ہوں گے۔ شاید مجھ سے کچھ بہتر آدمی وہاں ملیں گے۔ ان کے ساتھ رہنا ہے۔ اس موقع کو بیان کر کے اس کا سوانح نگار لکھتا ہے:

"یہ جسمانی اور رُوحانی (اخلاقی) مطلوبہ آئندہ چار سال کی سخت سردی، مصائب، شدید مشقت کے خیال سے نہیں گھبرایا تو کیا تعجب۔ دستوئیفسکی وہ شخص تھا جس کے جذبات میں توازن کی کمی تھی، غیرمعمولی صورتِ حال میں اسے آسائش ملتی اور طوفان میں اطمینان .... (37/5)

جیل سے رات کو نکلے، جب سارا شہر بڑے دن کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ تین قیدی تین گھوڑوں کی تروئیکا گاڑی۔ ہر ایک ہتھکڑی اور بیڑیوں کے ساتھ کوٹ کی کھال میں سکڑا ہوا۔ دورف، غم بہلانے کے لئے باتیں کیے جا رہا تھا۔ پولینڈ والا یاسترزمبسکی زندگی کی اُمید سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ دستوئیفسکی بڑے اطمینان سے آنے والے طوفان کے لئے خود کو آمادہ پا رہا تھا ـــــ بلکہ ساتھیوں کو بھی دلاسا

دیے جا رہا تھا۔

۸ اردن کے سفر کے بعد، جب ہاتھ پاؤں پر ٹھنڈے لوہے کے نشان جم چکے تھے۔ یہ کھلی گھوڑا گاڑی "بتولسک" کے (سائبیریائی) مقام پر پہنچ کر ختم گئی۔ یہ جنکشن تھا جہاں سے قیدیوں کو ان کے مقررہ جیلوں پر روانہ کیا جاتا تھا۔ یہاں ان کے شانوں اور کلائیوں کو قیدی گریڈ کے مطابق داغتے تھے۔ داغ کا وقت اس قدر اذیت ناک اور شرم ناک تھا کہ پولش نے خودکشی کی ٹھان لی۔ (دستوئیفسکی نے اسے مرنے سے باز رکھا)۔

دستوئیفسکی یہاں دس دن روکا گیا۔ یہیں کہیں دسمبری سرفروش (۱۸۲۵ء کی بغاوت والے) جیل سے رہا ہو کر نظربندی کی زندگی گزار رہے تھے، ان کی بیویاں جو گھر بار کی آسائش تج کر شوہر کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائے ہوئے ۲۵ برس پہلے آئی تھیں، وہ بھی یہیں تھیں اور سوشل خدمات کے کام سنبھالے ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو نے پہرے دار کو رشوت دے دلاکر قیدیوں کو ایک بار خدا حافظ کہنے کی سہولت حاصل کر لی۔

"گھبرانا نہیں، اومسک کے مقام پر لے جائے جا رہے ہو۔ ہم نے خبر بھیج دی ہے۔ وہاں ہمارے کچھ ہمدرد تمہارا خیال رکھیں گے۔"

اتنا کہا اور ہاتھ ملائے۔ انجیل کا تحفہ دیا اور اسی تحفے میں چھپے ہوئے دس دس روبل کے نوٹ۔ "جاؤ بسدھارو ۔ مشکل آسان ہو گی"۔

مصنّف دستوئیفسکی

کورے کاغذ سے کالے کاغذ تک

۱۹۱۰ء میں تالستائی کے انتقال کے بعد ذاتی خطوط کے پلندے میں ایک خط نکلا دستوئیفسکی کے پرانے ملاقاتی، ہمدرد اور مستند سوانح نگار استراخف کا، ۱۸۸۳ء کا لکھا ہوا۔ یہ اسی سوانح حیات کے بارے میں تھا۔ استراخف نے تالستائی سے اپنے مسودے پر رائے مانگی ہے اور اپنا تاثر لکھا ہے کہ جتنے دن میں اِس سوانح حیات کے کام میں لگا رہا، مجھے اپنے آپ سے لڑتے گزری کیوں کہ اس سے گھن آ رہی تھی اور تنفر کو دبانا پڑتا تھا .... وہ کینہ پرور، حاسد اور چڑچڑا آدمی تھا۔ ساری عمر اعصابی ہیجان میں بسر کی ......

اسی خط میں، کسی معاصر کے حوالے سے اُسے کم سِن لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کا ملزم قرار دیتے ہوئے استراخف لکھتا ہے کہ واقعی وہ شہوانی جذبات سے مغلوب اور بدذوق مصنّف تھا۔ ناولوں میں بھی اسی قسم کے بگڑے ہوئے کردار اس سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً زیرِ زمین آدمی کی یادیں" میں خود وہ زیرِ زمین، "جرم و سزا" میں سوِدری گائیلوف اور "بھوت پریت" (Devils) میں استاد روگن اُسی کے بدلے ہوئے رُوپ ہیں۔

یہ خط ۱۹۲۵ء میں لندن کے رسالے "Criterion" میں چھپا اور اس پر ہر طرف سے رائے زنی ہوئی، حمایت و مخالفت میں کئی اور شہادتیں بھی گزریں۔ سوال یہ اُٹھا کہ کیا ہم دستوئیفسکی کے تراشے ہوئے پیکروں میں خود مصنّف کو جزوی یا کلّی طور پر شناخت کر سکتے ہیں؟ کیا تخلیقی عمل میں وہ اپنے باطنی کردار کی تصویر کشی کرتا ہے؟

"........ سچ کہیئے تو میری رائے میں، جیسے دستوئیفسکی کی تصانیف اس کے وجود کا حصّہ ہیں ایسے کسی کی نہیں ......" ...... "ناولوں کے کردار اس کے اپنے وجود میں سے صادر ہوتے نظر آتے ہیں یا دل کے آس پاس موجود رہتے ہیں ...."

اس قسم کی رائے میں کسی قدر ترمیم کرتے ہوئے آندرے ژید نے اپنے جرنل میں لکھا کہ ہاں، ناول کے کرداروں کو ناولسٹ سے قریبی نسبت ضرور ہے، لیکن جو تصویر وہ کھینچتا ہے وہ خود

اس کی نہیں ہوتی، بلکہ یوں ہے کہ وہ خود ایسا ہو سکتا تھا اگر ایسا نہ ہوتا جیسا کہ تھا.....،،

اب ہم خود دستوئیفسکی کے تخلیقی عمل کو، اس کے شب و روز میں دیکھ کر اصلیت خود اسی سے دریافت کیے لیتے ہیں۔

"جرم و سزا" ناول کی تصنیف

جون ۱۸۶۵ء کا زمانہ ہے، رسالہ "اپوخا" بند ہوگیا، قرض خواہ سر پر سوار ہیں۔ عزیز رشتہ دار بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ دستوئیفسکی سوچتا ہے کہ کسی بہانے یورپ کی طرف نکل جائے۔ ممکن ہے جوئے کے چکّر میں گردشِ ایام سے نجات ملے یا وہ فتنہ ساز پولینا جو اقرار و انکار کے درمیان چکّر دے رہی ہے راہ پر آجائے ـــــ کچھ نہ ہو تو صحت سنبھلے۔ اسی بدحواسی میں مصنف کو ایک موضوع سوجھتا ہے: 'نیک دل شرابی' کا بدقماش خاندان ـــــ وہ اپنے پرانے پبلشر کو موضوع لکھتا ہے اور ناول کے لئے پیشگی رقم طلب کرتا ہے، پبلشر قبول نہیں کرتا۔ پھر دوسرے پبلشر سے رجوع کرتا ہے، وہ سخت شرائط پر راضی ہو جاتا ہے۔ رقم ہاتھ میں آئی اور دستوئیفسکی پاسپورٹ لے کر جرمنی روانہ ہوا۔ 'نیک دل شرابی' ابھی تصور میں بسا ہوا ہے۔ ویس بیڈن میں پولینا سسلووا بھی آگئی، رولٹ کا چکّر بھی چلا۔ چند روز میں دونوں طرف سے ناکامی ہوئی اور کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگیا۔ شادی کی انگوٹھی کے بعد کپڑے گروی رکھنے کی نوبت آئی۔ چھوارے جیسی صورت کے سنگ دل مہاجن سے تکرار کے بعد کچھ روپے ہاتھ لگے تو پیٹ میں روٹی پڑی۔ اس بے بسی اور فاقہ کشی کے وقت اس کا تخیل مہاجن کو قتل کرنے اور تجوری لوٹنے نکلا۔ "آخر اس قدر بے بسی کیوں؟ فرد کو اتنا تو اختیار حاصل ہے کہ سماج سے اپنا حق بزور وصول کرے! میں زندہ ہوں، زندہ رہنا چاہتا ہوں، اس کی خاطر سب کچھ جائز ہے۔ قتل بھی۔ اِن مردود سود خوروں کا قتل۔ سماج کی راہ سے ایک پتھر ہٹا دینے کا اختیار۔ جیل میں وہ ایسے 'قاتلوں' کے ساتھ رہ چکا تھا۔

روس میں ان دنوں نراجی، منکر (Raznochinzy) اور اشتراکی دہشت پسند زیرِ پوش حلقے سرگرم عمل تھے ہی۔ دستوئیفسکی ان کے قریب بھی رہا تھا۔ اس آگاہی کی بنیاد پر تصور میں نیا ہیرو اُبھرتا ہے، خود کو بے بس اور بے شعور عوام سے برتر شمار کرنے والا، خودی کے نشے میں ڈوبا ہوا اور فرد کا اختیار جتانے والا نوجوان طالب علم۔ یوں رسکول نیکوف کا خمیر اُٹھا اور اس کے گرد ناول کی رُوپ ریکھا بننے لگی پلاٹ پھیلایا تو اس میں "نیک دل" "شرابی" کی گنجائش پائی۔ اس کی نیک دل اور خوبصورت

بیٹی، "سونیا" تلاش کنبے کو پالنے کی خاطر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ماں باپ کی زخمی انا اور مجبوری کی رضا بھی بن کہے اس "دھندے" میں شامل ہے۔ رسکول نیکوف اُس کے جسم کو چھونے میں دکھتی ہوئی روح سے آشنا ہوا اور محبت کر بیٹھا۔ اس کی بے لوث، محبت نے سونیا کو، اپنی نظروں سے گری ہوئی سونیا کو عزتِ نفس کا گم شدہ جذبہ دیا، اور سونیا نے اس نوجوان میں گناہ و ثواب کا تصور بیدار کیا۔
یوں ایک تیر میں دستوئیفسکی نے دو شکار کرنے چاہے، نئی نسل میں نراجی تصورِ حیات کے خلاف آواز، گناہ و ثواب کے تصور کی تائید، قانون کے نزدیک جرم اور اخلاق کے نزدیک گناہ ـــــ دونوں کا فرق اُبھارنا اور دکھانا کہ ضمیر کی عدالت سے سزا پائے بغیر انسانی روح کو نجات نہیں ہو سکتی۔ گویا اصل خیال یا بنیادی نکتہ نظر کے سامنے، اس کا بار اُٹھا کر چلنے والے کردار بھی کم و بیش موجود، ثانوی حیثیت کے کیرکٹر بھی خود بخود سوجھتے گئے۔ لڑکے کے غریب ماں اور بہن، لڑکی کا باپ اور ماں ـــــ اور چھوٹی بہن - کاغذ بار بار رد کرنے کے بعد جب آخری پلان بنانے بیٹھا تو لڑکے کی بہن دونیا کو ـــ جو سونیا کا دوسرا، لیکن برعکس رُخ ہے ـــ ایک امیر عیاش کے یہاں گھریلو ملازمت کرتے دکھایا اور اس کا کردار صاحب خانہ سوِدری گائیلوف کے حیلوں اور ترغیبوں سے دامن بچاتے ہوئے اُبھارا۔

کہانی کا خاکہ تقریباً مکمل ہے لیکن اب تیکنیک نہیں سوجھ رہی۔

اب تک جو اہم تصنیفیں شائع ہو چکی تھیں ان میں مصنف نے صیغۂ واحد متکلم استعمال کیا۔ یعنی "میں" ـــ بیان کرنے والا خود ہیرو۔ ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" میں خیال کی اہمیت اور گرفت کے باوجود وہ تیکنیک فیل ہو گئی۔

پہلے اسی طرح ناول شروع کیا، پھر سوچا کہ اسے ہیرو کے روزنامچے کی صورت میں بیان کیا جائے، وہ بھی رد کیا۔ خیال آیا کہ ایک جدت ہوگی۔ ناول کو عدالت میں اقبالِ جرم کی صورت میں آگے لے جائے، ورنہ قید کاٹ چکنے کے بعد واقعۂ قتل سے متعلق یادِ ماضی کے بطور پیش کرے۔ دستوئیفسکی نے ہر طرح نقشہ جمایا، نوٹ بکیں سیاہ کر ڈالیں، تفصیلات جمع کیں، کرداروں کی، عمارتوں کی، مقامات کی لکیریں کھینچیں، ہیرو کا ناک نقشہ، اس مکان کا خاکہ۔ جہاں واردات ہونے والی ہے، وہ زینہ جہاں سے اُسے گزرنا ہے (اتفاق سے وہ خود مصنف کے بوسیدہ مکان کا نیم تاریک زینہ نکلا) اور وہ جگہ جہاں تجوری سے اُڑایا ہوا مال دبانا ہے ـــــ ساری تفصیلات درج کر چکنے کے بعد بھی پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ۱۸۶۵ء کی سردیاں اسی عالم میں گزر گئیں۔

"روس کی ولیست نِک" (نقیبِ روس) رسالے سے وعدہ تھا کہ ہر شمارے میں قسط وار ناول

شائع ہوگا۔ پہلی قسط بھیجی، بروقت بھیجی، بروقت ۱۸۶۶ء میں چھپ گئی۔ لیکن مصنف مطمئن نہیں ہوا۔ دُو طرف کا دھڑکا لگا ہوا ہے: ایک اپنے وعدے پر قائم رہنے اور قاعدے سے میٹیریل بھیجنے کا (دستوئیفسکی کو اس سلسلے میں اپنی ثابت قدمی کا بڑا دعوا تھا)، دوسرے یہ کہ نظرِ ثانی میں ناول کا پلان بدلتا اور پھیلتا چلا جارہا ہے اور کردار تیار شدہ لباس میں سما نہیں رہے ہیں۔

تین قسطیں بھیج دی گئیں۔ آخر مصنف خود راوی بنا، بار بار نظرِ ثانی کی اور جب شروع کے چار باب مکمل ہونے آئے تو پبلشر کو لکھا:

......مقررہ میعاد کی پابندی کرنے کی خاطر، اکثر یہ جی چاہتا ہے کہ جلدی میں بُرا لکھ ڈالوں، بہت ہی بُرا لکھوں۔ بہرحال یہ چیز جو بھیج رہا ہوں، قلم سنبھال کر اور جان لگا کر لکھی ہے اور میری کوشش ہے کہ، چاہے اپنی ذات کے لئے ہو ـــــ لیکن جب تیار ہو تو بہتر سے بہتر نکلے ـــــ ......

یہ بھی فکر ہے کہ "بڑی جنگ" لڑنی ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ناول از اوّل تا آخر بھاری ہو اور پھیکا پڑ جائے، اس میں تفریح کا کوئی پہلو، بلکے پھلکے کرداروں کے غیر معمولی معمولات بھی ملا دیے جائیں۔

دوستوں کے نام خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے گرمیاں آنے تک اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ کبھی کرسی پر بیٹھتا، پہلو بدلتا، کبھی مٹھیاں بھینچے ہوئے، کمرے میں آگے پیچھے ٹہلتا ـــــ کہتے ہیں کہ ان دنوں شب بیدار مصنف کا خیال رکھنے بلکہ مرگی کے دَورے کے وقت دیکھ بھال کے لئے ایک خدمت گار مقرر کیا گیا تھا ــ وہ چند روز میں بھاگ لیا اور عذر یہ کیا کہ مریض پر کسی کا خون سوار ہے، آپ ہی آپ بڑبڑاتے اور عجب عجب حرکتیں رہتے ہیں۔ دیکھنے سے خوف آتا ہے۔

گرمیاں آگئیں اور دستوئیفسکی اپنا ادھورا مسودہ اور کٹی پھٹی نوٹ بکوں کا پلندہ لیے ہوئے پیٹرسبورگ سے نکل آیا۔ ماسکو پہنچا اور ماسکو سے باہر بہن بہنوئی کے بنگلے میں نزدیک ہی کرائے پر ایک کمرہ مل گیا۔ یہاں وہ کھانے پر گھر والوں کے ساتھ بیٹھتا، بچوں سے جی بہلاتا، گھریلو آسائش سے لطف اندوز ہوتا اور باقی وقت سب سے الگ، تصباتی کمرہ، دالان، باغیچہ، خاموشی، تنہائی اور اپنا وہی مخمصہ۔

جا بجا اصلاحیں، حاشیوں پر اور بین السطور میں کاٹ چھانٹ، اکثر کسی معمولی واقعے یا ایک آدھ لفظ کی خاطر اَدل بدل۔ کہیں وہ کردار کی عمر بدلتا ہے، کہیں نقد رقم میں کمی بیشی، پہلے محض اشارہ تھا، نظرِ ثانی کے وقت کردار کو خاص نام دیتا ہے یا مبہم صفات کا ذکر نکال کر نام کے ساتھ ایک قطعی صفت بڑھا دیتا ہے۔ کہیں جملے میں الفاظ کی ترتیب یا پورے جملے کی ساخت بدل ڈالتا ہے تاکہ جہاں زور دینا مقصود ہے

وہیں زور پڑے۔ (۱۳۳-۹)

یہاں تک کہ جاتی گرمیوں کی صبح کا اُجالا ہونے لگتا اور وہ لیمپ بجھاکر، کاغذ بکھرے چھوڑ کر بستر پہ دراز ہو جاتا۔ بستر پر پہنچنے کے بعد بھی کاغذی پیرہن فریاد کر کر کے اس کی نیند اُچاٹ کیئے رہتے۔ کام کا معمول یہ تھا کہ دن چڑھے اور بعض اوقات دن ڈھلے اٹھنا، ایک دو پیالی سادہ چائے، منہ ہاتھ دھونا، لباس کی تبدیلی ـــــ اور لباس کے معاملے میں پائے تخت پیٹرسبورگ کی صحبتوں نے اُسے بڑا محتاط کر دیا تھا، جوتے کے تسموں سے لے کر ٹائی کی گانٹھ تک ہر شے بے داغ اور برمحل۔ ناشتہ ہی گویا دن کا کھانا تھا ـــ اس کے بعد مطالعے کے کمرے میں۔ جو لکھتا ہے اُس کے نوٹ اور پُرزے، پلان اور خاکے تیار ہو رہے ہیں۔ شام ہوتے وہ پھر نکلتا ـــــ اور گھر سے باہر ملاقاتیوں میں چلا جاتا۔ شام کا کھانا ہی ڈنر تھا۔ تھوڑی دیر گھر والوں یا آنے جانے والوں سے مل کر وہ پھر سماور سمیت مطالعہ گھر میں۔ رات رات بھر مصنّف کے ساتھ سماور بھی جاگتا رہتا اور آدھ جلے "پپی روسوں"(۴) کے دھوئیں سے کمرہ اور چہرہ اَٹ جاتا۔ آدھی رات اور صبح کے درمیان جو کچھ لکھا، سہ پہر میں اس پر رندا پھیرا ـــــ یا آئندہ پر اٹھا کر رکھ دیا،

اپنی تحریر پر نظرِ ثانی کے بارے میں وہ بہت بے رحم ہے۔ ایک ایک مقام پر دس دس بار تبدیلیاں کی ہیں اور کرداروں کا رخ ہی بدل ڈالا ہے۔ جب ہمدرد پبلشر نے مشورہ دیا کہ "جرم و سزا" کے فلاں باب ([illegible] کا مطالعہ) سے غلط فہمی پھیلے گی، اس میں ترمیم کر دی جائے تو وہ پھر نظرِ ثانی پر آمادہ ہو گیا اور لکھا:

"...... اس ایک باب کے اول بدل میں اتنی محنت اور وقت لگا ہے کہ اتنے میں آدمی تین نئے باب لکھ ڈالے ......"

جن دنوں دس برس کی غیر حاضری کے بعد ادب میں پھر پہلی سی شان کے ساتھ اُترنے کی کوشش کر رہا تھا اور سائبیریائی قصبے کی ایک کاٹھ کوٹھری میں بیٹھا "مُردہ گھر کی یادیں" لکھ رہا تھا، بھائی نے خط میں کہیں ٹوک دیا، اس پر تنک کر جواب دیتا ہے:

...... کیا کہا؟ پوری تصویر ایک نشست میں بن جانی چاہیے؟ یہ خیال تمہارے دماغ میں کہاں سے بھر گیا؟ میری بات مانو ـــــ ہر کام میں، ہر چیز میں محنت لگتی ہے، ہاں لگاتار جان کھپانی لازم ہے۔ پوشکن کے بعض مصرعے، سلیس، بے تکلف اور چست، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ ٹپک پڑے، مگر پوشکن نے بندشِ الفاظ میں، نظرِ ثانی میں نجانے کتنا وقت کھپایا ہوگا۔ اس کی

(۴) خاص روسی وضع کے سگریٹ جن میں کاغذ کی آدھی سے زیادہ نلکی خالی رکھی جاتی ہے۔

بدولت ہے یہ بے ساختگی۔ پختہ تصنیف دینے میں صرف قدرتِ کلام یا قدرتی جوہر سے کام نہیں چلتا۔ کہتے ہیں کہ شکسپیر کی تحریروں میں کہیں دماغ پاشی (یا نظرِثانی)، کا گمان نہیں گزرتا۔ تبھی تو یہ بات ہے کہ ان میں جگہ جگہ خامی نظر آتی ہے اور کتنا کچھ ہے جو مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔ اگر اس نے [اپنی تصانیف پر] زیادہ وقت کھپایا ہوتا تو حاصل کہیں بہتر نکلتا ....“

(۳۱ر مئی ۱۸۵۸ء)

اس پرائیویٹ خط میں دستوئیفسکی نے دون کی نہیں لی ـــــ یہ اس شخص کا ریمارک ہے جس کے ناولوں نے شکسپیر کی چھتر چھایا میں پروان چڑھے ہوئے مغربی ذوقِ ادب کو چونکا دیا۔ حال کا ایک صاحبِ نظر نقاد اس پر لکھتا ہے:

”.......جہاں تک ادبی آرٹ کی خاص حدود کا تعلق ہے، عالمی ادب کا طالب علم حق بجانب ہے اگر وہ عالمی ادب کو دستوئیفسکی سے قبل اور دستوئیفسکی کے بعد والے دور میں تقسیم کرے .... (۱۱۶-۱۵)

قصہ مختصر یہ کہ گرمیاں گئیں، خزاں کا موسم آ پہنچا اور ”جرم و سزا“ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ دستوئیفسکی کو پچھلے سال کا وہ بے رحم شرط نامہ یاد آیا جس کے مطابق ۱۳ اکتوبر تک مختصر ناول دوسرے پبلشر (ستیلوفسکی) کے حوالے کرنا تھا۔ یہ ناول ناتمام چھوڑا۔ اور دوستوں سے مشورہ کیا۔ تین اہلِ قلم سر جوڑ کر بیٹھے کہ دستوئیفسکی خاکہ بتائے، اسے تینوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ جب وہ الگ الگ باب لکھ لائیں، مصنف انھیں جوڑ کر، درست کر کے اپنے نام سے پبلشر کے حوالے کر دے۔ یہ تدبیر کچھ راس نہ آئی۔ تب نئی نئی اسٹینوگرافی سے کام لینے کی ترکیب سوجھی اور ۲۵ دن کے اندر مصنف کی ۴۵ ویں سالگرہ کے دن ۳۰ اکتوبر ۶۶ء کو مشہور ناولٹ ”جواری“ مکمل ہو گیا۔ پبلشر آخری دن (شاید ارادۃً) شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ دستوئیفسکی نے معاہدے کی کڑی شرطیں نظر میں رکھتے ہوئے ناولٹ کا مسودہ حلقے کے تھانے میں جمع کرا کے رسید لے لی۔ تاکہ مقررہ میعاد میں لکھت پوری کرنے کی سند رہے۔ فوری اور ہلکے کام سے نمٹتے ہی پھر اسی اسٹینو کے گھر پہنچا کہ ”جرم و سزا“ کے باقی ماندہ ۲، ۳ باب بھی اسی صورت سے لکھوا دیے جائیں۔

وہ رات میں نوٹ تیار کرتا، مکالمے لکھتا، کرداروں کی تفصیلات کے خاکے پر نظرِثانی کر کے رکھتا؛ دن چڑھے جب تیار ہو کر نکلتا تو کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے ٹہل ٹہل کر ناول بولتا چلا جاتا اور بار بار میز پر اپنی یادداشتوں پر نظر ڈال لیتا۔

بیچ بیچ میں چائے تیار ہو جاتی، کاغذ کے پیکٹ میں سے ناشپاتی نکال کر وہ اس کم سخن گر

سنجیدہ لڑکی کی طرف بڑھا دیتا اور چائے کے دوران ذاتی واقعات سننے سنانے بیٹھ جاتا۔ اور پھر یکایک گویا کسی اندرونی اضطراب سے گھبرا کر سگریٹ جلا لیتا اور اُٹھ کر پوچھتا:

"ہاں تو کیا لکھا —— اس شہر میں ......؟"

"شہر رولٹن برگ میں ......؟"

"یہ نام کس نے لکھوایا! ایسا تو کوئی شہر ہی نہیں"

"آپ نے شروع میں لکھوایا تھا، رولٹ جوئے کی نگری۔" رولٹن برگ"

"اچھا تو یہی رہنے دو اس ناولٹ کا نام"

بعد میں اس کا نام جواری (Igrok) قرار دیا۔

اور سال تمام نہ ہوا تھا کہ "جرم و سزا" کا آخری مسودہ بھی مکمل ہو گیا۔

مسودے کی تکمیل پر دستوئیفسکی ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے ......" کافی لمبا ناول ہو گیا، چھ حصّوں میں۔ نومبر ختم ہوتے ہوتے اس کا بڑا حصّہ لکھا جا چکا تھا، تیار تھا۔ میں نے سب کاغذ پھونک دیے۔ صاف کہہ دوں کہ اس سے کچھ مطمئن نہیں تھا۔ نیا فارم، نیا نقشہ سوجھا ہے، از سرِ نو لکھتا ہوں۔ دن رات لکھنے پر لگا ہوں، پھر بھی رفتار سُست ہے۔

ناول ختم کے قریب پہنچنے لگا تو مصنف کو محسوس ہوا کہ اصل کردار —— بڑے اہم خیال کا بوجھ ڈھونے والا —— نوجوان قاتل رسکول نیکوف، اپنے سامنے کے ثانوی کردار "سونیا" سے دب گیا۔ "سونیا، جو راضی برضا "نیک دل شرابی" مرمیلا دوف کی جسم فروش بیٹی ہے۔ رسکول نیکوف سے اس کی خاموش، پُرسوز محبّت اور خود کو حقیر و گنہگار شمار کرنے کی خصلت ہی قاتل کو اعترافِ جرم پر آمادہ کرتی ہے۔

خودی، قوّتِ ارادی اور اختیار کے فلسفے کی پیداوار نیم پخت شخصیت اس نیک طینت بدکار چھوکری کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔

......سونیا اس دبی کچلی مصیبت زدہ عالمِ انسانیت کا ایک جیتا عالی نمونہ (سمبل) ہے جو مسرت انگیز

پُنرجنم (حیاتِ نو) کا لازوال تخم اپنے اندر پال رہی ہے .... (۱۶۳-۹)

نیم پخت فلسفی نے دیو قامت فن کار کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

ناول کی آخری قسطیں نکلیں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ رُوس نے مہذب دنیا کو ایک نئے قسم کا ناول دیا تھا، نفسیات، فلسفہ اور اخلاقیات کے مسائل سے دست و گریبان متحرک کرداروں کا ناول۔

دستوئیفسکی کا یہی ناول اس کی موت کے پانچ چھ سال بعد انگریزی میں دستیاب ہوا تو [رابرٹ لوئس] اسٹیونسن نے ایک خط میں لکھا:

> بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے دس سال میں جو کچھ پڑھا ہے، اس میں سب سے زبردست تصنیف یہ "رسکول نیکوف" ہے..... بہت سے لوگ اسے بے لطف پاتے ہیں؛ ہنری جیمس اس ناول کو ختم نہ کر سکا؛ مگر میں تو بس یہی کہوں گا کہ اس ناول نے مجھے قریب قریب ختم کر دیا۔
>
> (۳-۱۲)

اور مصنف ناول کا مسودہ حوالے کرکے ہاتھ ملتا رہ گیا کہ کاش اَور وقت ملا ہوتا! کاش میں اطمینانِ قلب کے ساتھ اسے اور سنوار سکتا۔

تلاش، تخیّل، تجربہ

دستوئیفسکی نے ۶۰ سال عمر پائی، اور کل ملا کر تیس سال تصنیف میں صرف کیے۔ اِس مختصر عرصے میں دس قابلِ ذکر ناول دیے اور ۳۰ سے زیادہ ناولٹ اور مختصر افسانے۔ بعضوں نے چھ اور اکثر نے پانچ ناول چنے مگر سب نے بالاتفاق کم از کم چار بڑے ناولوں کو عالمی ادب کا شاہکار قرار دیا ہے: "جرم و سزا" "ایڈیٹ"، "بھوت پریت ("The devils")" اور "برادران کرامازوف"

دوسری اور کامیاب شادی کے اوّل چار سال میں (۷۱ - ۱۸۶۷ء) تین ناول لکھے گئے اور بعد کے برسوں میں چوتھا۔ جس کے متعلق ارنلڈ بینیٹ (A. Bennett) رقم طراز ہے:

"...... [آندرے] ژید سے میری پہلی ملاقات دستوئیفسکی کے بے کنار میدان میں ہوئی۔ اُس نے کہا اور میں نے اتفاق کیا کہ 'برادران کرامازوف' جیسا زبردست ناول آج تک لکھا ہی نہیں گیا تھا ...... وقت نے ہماری رائے اور پختہ کر دی ہے مگر ژید کا کہنا ہے کہ دستوئیفسکی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ پڑھنے قابل ہے اور کسی تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" (۸ - ۳)

کچھ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ عمر کے چالیس سال گزرنے کے بعد دستوئیفسکی کے فلسفیانہ نظریات اور اُس کا فن، دونوں پختہ ہو چلے تھے، کچھ اہلِ قلم (خصوصاً خواتین) کی نظر میں یہ تھی خانہ داری کی آسائش کی برکت ـــــ یوں بھی ہوگا، لیکن اصل اور اہم سبب ہے مسلسل تلاش کا مادہ، تخیّل کی پرواز، تجربے کی وسعت اور اپنی تحریر پر قلم پھیر دینے کی ہمت ـــــ

اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے خود دستوئیفسکی کی مختلف تحریروں سے اور ان کرداروں کی زبان سے، جنھیں مصنّف کسی خاص موقع پر تھوڑی دیر کو اپنا نمائندہ بنا کر لاتا ہے۔ "ایڈیٹ" کا ایک نوعمر جانہار کیرکٹر "ایپولیت" خودکشی کی صبح ہونے سے پہلے کہتا ہے:

"...... یقین کیجیے، کولمبس تب خوش نہیں تھا جب اُس نے امریکہ دریافت کر لیا، بلکہ اُس وقت، جب وہ امریکہ تلاش کر رہا تھا۔ میری بات مانیے، اُس کی دلی مسرّت کا سب سے عالی شان وقت نئی دنیا کی دریافت سے ٹھیک تین دن پہلے گزرا جب اس کے باغی ملاح تنگ آ کر یورپ [اپنے وطن] لوٹ جانے پر تُل گئے تھے۔ اصل چیز وہ نئی دنیا نہیں تھی، اُس کے پُرزے بھی اُڑ جاتے تو کیا بگڑتا! کولمبس آخر اسے دیکھے بغیر

ہی مرگیا۔ اسے کہاں پتہ چلا کہ کیا دریافت کرلیا ہے۔ اصل چیز تو زندگی ہے ـــ صرف زندگی، تلاش کا مسلسل تلاش کا عمل، کسی دُھن میں جینا، پھر دریافت کرلینا نہیں بلکہ دریافت کی خاطر انتھک کوشش کیے جانا (اسی میں زندگی کا لطف ہے)........" (۴)

غور طلب بات ہے کہ تصنیف کا خیال کہاں سوجھا، پہلی بوند کیسے ٹپکی، انسپریشن کدھر سے ملا؟؟ "جرم و سزا" جرمنی میں جوئے کی میز پر سوجھا؛ عین فاقہ مستی، مادی اور ذہنی کرائسس کے لمحے میں۔ "جواری" بھی وہیں کی آپ بیتی (یعنی تجربے) سے نصیب ہوا۔ "ایڈیٹ" کا خیال اُن متضاد کرداروں نے دیا جن سے کچھ عرصہ پہلے مصنف کو سابقہ پڑ چکا تھا اور "بھوت پریت"، یوروپ کے اشتراکیوں سے جڑی ہوئی، روس کی سیاسی دہشت پسند روپوش تحریکوں سے مایوسی اور بے زاری نے دیا ـــ ان چاروں ناولوں کی اٹھل پتھل ذہن میں جاری رہی۔ یہاں تک کہ اُس نے ضرورتاً یا مصلحتاً "جواری" کو ہلکی ذمہ داری سمجھ کر پہلے ادا کر دیا اور "جرم و سزا" کے پلاٹ، مکالموں، کرداروں اور تفصیلوں میں دماغ دو سال اُلجھائے رہا۔

اِنسپریشن' کا تو ایک ہی لمحہ ہوتا ہے، باقی سارا کام فن کار کا ہے"، یہ بات اُس نے پہلو بدل بدل کر کہی ہے۔ ایک مقام پر طبع زاد لکھنے والے کو 'شاعر' قرار دیتا ہے کہ تخیل کی قوت یا فکر کی پرواز غیب سے نصیب ہوتی ہے اور تصنیف کی بنیادی اینٹ وہی ہے۔

سب سے مقدم یہ کہ ایک یا کئی زوردار نقش فن کار کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں؛ (فن کاران کا تجربہ کر چکا ہو)، وہ ہیں شاعرانہ بنیاد، بعد میں آرٹسٹ انھیں اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور شاعر اس کا ہاتھ بٹاتا رہتا ہے۔

اِس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے اسٹین برگ (A. Steinberg) نے لکھا ہے کہ:

"...... تحریر و تصنیف کے عمل میں یہ نہیں ہوا کہ چشمِ باطن کے سامنے واقعات اور پیکر ترشے ہوئے رکھے تھے، مصنف نے ان کو ایک سلسلے سے جوڑ کر کوئی رُوپ دے دیا۔ گویا اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ برمحل اور موزوں الفاظ کے ساتھ انھیں کاغذ پر اُتارتا چلا جائے؛ جب وہ تصنیفی مشغولیت کے دوران عموماً بے خواب راتیں گزارتا تھا، وہی وقت ہوتا تھا اُس کے فیصلہ کن اور نہایت نازک فن کارانہ تجربے کا۔ حواس کی شدت کے اس عالم میں مصنف کا تخیل اکثر و بیشتر نیم طلسمی (Quasi-magical) قوت سے مالا مال

---

(۴) ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو (غالب)

ہوجاتا؛ یعنی پہلے سے جو اتفاقات یا حادثے اکٹھا کر رکھے تھے اب انھیں زمان و مکان میں رکھ کر سوچا گیا! ایک کے بعد ایک تخیلی صورت اُبھرنے لگی اور الگ الگ خیالی پیکر ٹھوس جسمانیت اختیار کرتے گئے اور قطعی وجود پاتے ہی اپنے خالق (مصنف) کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگے، گویا کوئی آسیبی نظر ہو، یوں مشاہدہ کرنے والے کے اِس غیر معمولی (ماورائی) تجربے کے اثر میں — جسے خود مصنف نے قلم بند کیا ہے — خارجی اور داخلی دنیا کے درمیان کی لائن مِٹ گئی اور ان دونوں دنیاؤں کا خلط ملط ہو جانا ہی دستوئیفسکی کے آرٹ کی اصل خصوصیت ہے۔ (۷، ۰۰-۱۰)

دستوئیفسکی جو بار بار جتاتا ہے کہ تصنیف کے عمل میں اصل شے خیال اور ذہنی تلاش ہے، باقی کام ہے مصنف کے تجربے کی نوعیت اور فن کار کی محنت کا۔ تو خود اس نے اپنے قیاس یا تخیل کو تجربے کی غذا دی ہے، اور اس کی خاطر وہ کڑی آزمائشوں سے گزرا ہے۔

سائبیریا کی قید بامشقت کے چار سال نے اُسے ایسے لوگوں سے ملایا جو بظاہر مجرم تھے اور اندر سے بھلے آدمی، بظاہر عزت دار تھے اور اندر سے پاجی — وہاں اس نے لوگوں سے کٹ کر "اشراف" کی زندگی بھی بسر کی اور اشراف سے منھ پھیر کر بھولے بھالے آدمیوں سے بھی خلا ملا رکھا اور یہیں سے وہ عادی مجرموں کی ذہنیت اور "بے قصور مجرموں" کی ذہانت سے آگاہی لے کر نکلا۔ تب آدمی کی شناخت کے بندھے ٹکے اصولوں پر شبہ ہوا اور اس شبہ نے تلاش کی نئی سمتیں کھول دیں، تبھی وہ اصرار کرتا ہے کہ :

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

(غالبؔ)

پھر سوا پانچ سال سائبیریا کے دور افتادہ قصبے سیمی پلاتنیسک میں گزارے؛ عام فوجی کی سپاٹ زندگی، روکھے پھیکے مقامی مسائل، قصباتی زندگی کے سادہ پُرکار جوڑ توڑ جس کی بدولت روزمرہ کی یک رنگی ٹوٹتی ہے، وہ ان سب میں شریک رہا اور انوکھے تجربات کے طلسمی پیکر ذہن میں سجا لیے۔

"چچا میاں کا خواب" اور "استیپان چیکوو گاؤں میں" دونوں دل چسپ کہانیاں جن کی ڈور سے دستوئیفسکی نے ادبی دنیا کے ساتھ اپنا دس برس پرانا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا ——

اسی قصبے کی دین ہیں اور قصباتی زندگی کے آئینہ دار۔ پائے تخت کے جن اونچے گھرانوں میں اُس جیسے آدمی کا جوڑ نہیں بیٹھتا تھا، جہاں اُس پر جملے کسے جاتے تھے، پھبتیاں کہی جاتی تھیں، وہاں بھی اُس نے اپنا قدم رکھا اور ایسے ناآسودہ گھروں سے بھی منہ نہیں موڑا جہاں صرف ناآسودگی کی سوغات مل سکتی تھی۔

فن کار نے بعد کی کاٹ چھانٹ، تراش خراش تو "اعتکاف کے چلّوں" میں انھیں بند کمروں میں کی، جو سگریٹ کے دھوئیں اور چائے کے بھبکے سے اَٹے رہتے تھے۔ اور مرگی اور بواسیر کہنہ کا مریض جن میں راتوں کو صبح کیا کرتا تھا — لیکن اس کے مشاہدوں کی کائنات بڑی وسیع اور گہری ہے۔ مشاہدے بھی وہ جو ایک تماشائی کے نہیں، زندگی سے دست و گریبان رہنے والے اور سماجی و سیاسی مسائل میں دّرانہ قدم رکھنے والے کے مشاہدے ہیں۔

"رولٹن برگ" کے پھیرے اور بوکلینا یا پبلشر کے آگے پیچھے دوڑنے کی زندگی تو سامنے کی بات ہے، لیکن اس کے پسِ پردہ یوروپ کی تہذیب کو کھنگالنے اور قریب سے دیکھنے برتنے کی جو کاوش دستوئیفسکی نے عمر بھر جاری رکھی اور طرح طرح کے بہانے تراش کر یوروپ کے تین طوفانی دورے کیے، وہ بھی بالآخر اس کے تجربات کی تجوری بھرنے کے کام آئے۔

نوجوانی میں سیاسی سرگرمیوں سے یا گرم بازو سے سروکار رکھنا کہیں فیشن ہوتا ہے اور کہیں سوجھ بوجھ کی نشانی، کہیں دونوں؛ دستوئیفسکی کو بھی اس کا حصّہ ملا۔ لیکن فن کار کی نظر کو رزق ملا — قید بامشقت اور دس برس کی جلاوطنی میں جس طرح روزنِ دیوار سے چھنتی ہوئی کرن ذرّوں کو روشن کر دیتی ہے، ایسے ہی قید کے مشاہدوں نے الگ الگ افراد کا باطن اس پر روشن کر دیا — اور ورقِ ناخواندہ پڑھنے کی کاوش میں اس کی نگاہ، نگاہِ تخیل درّاک ہو گئی۔

دستوئیفسکی کی عمر پچاس سال سے اوپر ہے، اب وہ اپنی زبان کے نمایندہ چار پانچ بڑے ادیبوں (تورگنیف، تالستائی، نکراسوف اور شچدرین) میں شمار ہوتا ہے، دم مارنے کی فرصت نہیں اور اس پر بھی وہ روزمرّہ کے شہری مسائل میں دخیل رہتا ہے اور ان پر رائے زنی کو اہلِ قلم کا فریضہ شمار کرتا ہے۔

"ادیب کی ڈائری" کے نام سے جو ماہانہ رسالہ وہ شائع کر رہا تھا، جو وقت پر مشکل سے ہی نکلتا تھا، بالآخر تین سال نکل کر (۷۶-۱۸۷۷ء) بند ہو گیا۔ اس کا مطالعہ کیے بغیر نہ اس کے ناولوں کہانیوں کی کُنہ سمجھ میں آسکتی ہے، نہ اس کی مسیحی خاکساری کی بنیاد۔ یہ رسالہ کیا

تھا، اس کا روزنامچہ ہی تھا، مگر ایسا روزنامچہ جس میں وہ اخباری، علمی، ادبی، تہذیبی اور ذاتی مسائل پر اپنے تاثرات اور اپنی سرگرمیوں کی رُوداد دیا کرتا تھا ــــــ

روزمرّہ کے معاملات سے اپنا رشتہ محسوس کرنے اور اظہار خیال کرنے پر یوں تو اور بھی کئی نوٹ گواہ ہیں، لیکن یہاں ہم صرف ایک واقعہ لیتے ہیں جو اس ڈائری میں دو سال تک چلا (مئی ۱۸۷۶ سے دسمبر ۱۸۷۷ء تک)

مئی ۱۸۷۶ء کے اخباروں میں پیٹرسبورگ کے ایک حادثے کی رپورٹ چھپی۔ ۱۹، ۲۰ برس کی ایک کسان عورت کرنیلووا نے، جو پہلے حمل سے تھی، چھ سال کی اپنی سوتیلی بیٹی سے کہا کہ کھڑکی پر چڑھ کر ذرا نیچے دیکھو۔ لڑکی چوتھی منزل کی اس کھڑکی پر چڑھی تو سوتیلی ماں نے اُسے دھکا دے دیا۔ وہ اوپر سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ کرنیلووا نے جُھک کر دیکھا اور سمجھی کہ لڑکی مر گئی۔ دیکھتے ہی وہ خود ہوش کھو بیٹھی اور دوڑی ہوئی حلقے کے تھانے میں پہنچی اور وہاں اس نے سچ سچ رپورٹ لکھوا دی۔ تھوڑی دیر بعد راہ گیروں نے بچّی کو اٹھایا تو وہ بالکل صحیح سلامت تھی۔ کپڑے جھاڑ کر چل دی۔ مقدمہ چھ مہینے چلا، قتل کے اقدام میں کرنیلووا کو دو سال آٹھ مہینے کی قید بامشقت اور پھر عمر بھر کی جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

دستوئیفسکی نے اس رپورٹ پر اپنے روزنامچے (The diary of a writer) میں تبصرہ کیا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ عورت اس جُرم کے وقت پہلے حمل سے تھی۔ اور جو حرکت سرزد ہوئی اس کے فوراً بعد پولیس کو گویا "اپنے جرم" سے آگاہ کرنے گئی، حالاں کہ وہ اپنی بے خبری بھی ظاہر کر سکتی تھی۔

> ...... میں کوئی میڈیکل آدمی نہیں ہوں۔ لیکن بچپن کی ایک کہانی یاد آتی ہے کہ ماسکو میں ایک عورت جب بھی حاملہ ہوتی تو ایامِ حمل کے بعض خاص دنوں میں اس پر چوری کرنے کا خبط سوار ہو جاتا۔ جان پہچان والوں کی رقم اور چیزیں اُڑا لاتی۔ دوکان داروں کو چرکا دے کر خریداری کے بہانے سامان پار کر دیتی۔ بعد میں اس کے گھر والے اس کا مال واپس کراتے۔ یہ عورت تعلیم یافتہ بھی تھی، خاندانی بھی۔ چوری میں اس کا ارادہ اور شعور شامل رہتا تھا۔ حمل کے خاص ایام گزرنے کے بعد وہ بالکل بدل جاتی اور خود نہیں بتا سکتی تھی کہ چوری کا دورہ کیوں پڑا تھا۔

دستوئیفسکی نے اس بحث کو آگے بڑھایا اور کہا کہ قیاس چاہتا ہے کہ شوہر بار بار اپنی پہلی بیوی کا نام لے کر اس نو بیاہتا کو طعنے دیتا ہوگا، سوتیلی بیٹی کے سبب گھر میں تکرار ہوتی ہوگی اور کرنیلووا کو

محسوس ہوتا ہوگا کہ فتنے کی جڑ یہ لڑکی ہے جس کی خاطر اسے شوہر کی محبت کے بجائے تلخی ملتی ہے۔ حمل کے ایام اور خانگی زندگی کا یہ پہلو فوری اشتعال کا سبب بنے اور "جرم" سرزد ہوا۔ جرم میں ارادہ ضرور شامل تھا لیکن ایسا ارادہ جس کا سبب یا توڑ خود مجرم کو نہیں معلوم۔

تبصرے پر بحث چھڑ گئی اور حریفوں نے الزام دیا کہ دستوئیفسکی معصوم بچّوں کی جان کا دشمن ہے۔ وہ ایک مجرم کی تائید میں قیاسی گھوڑے دوڑا کر مقدمہ زیر سماعت پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے۔

کرنیلووا مقامی جیل میں تھی۔ بڑے جتن کر کے دستوئیفسکی اُس سے ملنے وہاں پہنچا اور ایک دو بار کی ملاقات کے بعد اُس نے پایا کہ قیاس یا تخیل نے اصلیت تک پہنچنے میں غلطی نہیں کی تھی۔

...... میں خود حیران ہوں کہ میں نے جو تصور قائم کیا تھا اس کا تین چوتھائی درست نکلا، قیاس اتنا صحیح کام کر گیا کہ گویا میں خود جائے واردات پر موجود تھا (اور چشم دید بیان دے رہا ہوں) ....

دستوئیفسکی نے اگلی اشاعت میں اپنی ملاقات کا حال لکھا اور بتایا کہ کرنیلووا ایک خوش مزاج الھڑ عورت ہے، اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے اور شوہر اسے جی جان سے چاہتا ہے، اگر اسے سزا ہو گئی تو شادی فسخ ہو جائے گی اور خاندان بکھر جائے گا۔

جیل میں اس کے بطن سے بچّی پیدا ہوئی۔ مصنف نے سوال اُٹھایا کہ اس نومولود بچّی کا کا کیا تصور ہے کہ ماں کے ساتھ عمر قید کی سزا کاٹے۔ پھر جیل کے انسپکٹروں کی زبانی رپورٹ چھاپی کہ جیل میں داخل ہونے کے اول چند روز تو وہ بڑی بد طینت اور بد زبان نظر آتی تھی لیکن دو تین ہفتے بعد ہی بالکل ہی بدل گئی اور اپنے حسنِ اخلاق سے سبھوں کے دل موہ لیے۔

مقدمے میں وکیل سرکار کا اصرار اس پر تھا کہ اقدامِ قتل ارادۃً اور شعوری حالت میں کیا گیا۔ دستوئیفسکی نے سوال کیا کہ کیا پولیس رپورٹ جو خود مجرم نے بہ ثبات عقل و ہوش لکھوائی بے ارادہ تھی؟

'میں پھر پوچھتا ہوں کہ ارادہ یا شعور کا دخل اس جیسے واقعے میں کہاں تک ہے؟ شعوری حالت کے قائم رہتے بھی .... وہ مریضانہ کیفیت کے خبط یا جنوں کے ہاتھوں بالکل بے قابو ہو گئی .... اگر جسمانی طور پر وہ مریضانہ حالت نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ وہ خود سے کہتی کہ یہ لڑکی فتنہ ہے، اسے اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینک دوں کہ اس کے کارن روز روز

طعنہ اور تکرار سے جان عذاب میں ہے ـــــ یہ کہتی اور ٹال جاتی ......

دستوئیفسکی نے پھر یاد دلایا کہ اگر جیوری اس پہلو سے غور کرے کہ رحم کرنے میں خطا ہو جانا بہتر ہے اس سے کہ سزا دینے میں خطا ہو جائے تو پورے مقدمے کی کارروائی پر پھر غور کر لینا مناسب ہوگا۔

اپیل دائر ہوئی۔ اپریل ۱۸۷۷ء میں پھر مقدمہ زیر سماعت آیا اور دستوئیفسکی کی تحریروں، تبصروں اور نفسیاتی تاویلوں کو نظر میں رکھ کر عدالت نے کرنیلووا کو بری کر دیا۔

دستوئیفسکی نے اپنی "وکالت کی فتح"، پر بغلیں نہیں بجائیں بلکہ رہائی کے فیصلے کے ۸ مہینے بعد تک خاموشی سے جانچتا رہا کہ رہائی کا اس خاندان پر ـــ شوہر، بیوی اور بچی پر کیا اثر پڑا ہے ـــ کیا یہ ویسا ہی ہے جیسا مصنف نے سوچا تھا؟ پھر جب تصدیق و تشفی ہو گئی، تو دستوئیفسکی نے مخالفین کو للکارا اور جتایا کہ رہائی کو نفسیاتی نتیجے سے جانچئے!

... زنا کے جرم میں ایک عورت کو سنگسار کیا جاتا ہے اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ، خبردار، اب کبھی گناہ نہ کرنا، تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ رہائی پاکر گھر جائے اور پھر زنا کرے! کرنیلووا کے معاملے بھی اصل سوال یہی ہے کہ [رحم کا] بیج کس دھرتی پر گرا؟ مجھے (آٹھ مہینے اس عورت کا برتاؤ دیکھنے کے بعد) معلوم ہوتا ہے اور میں حتماً کہہ سکتا ہوں کہ بیج اچھی زمین پر گرا۔ ایک انسانی وجود کو حیاتِ تازہ نصیب ہوئی، کسی کو قطعی کوئی نقصان نہیں پہنچا، پشیمانی کے بوجھ تلے اس عورت کی آتما اتنی پِس چکی ہے اور اسے اتنا رحم، اس قدر مہربانی ملی ہے کہ اُس کا دل اب کبھی بُرائی یا شیطانی پر مائل نہ ہوگا......

اتنی تفصیل میں یہ واقعہ لکھنے کی ضرورت یوں پڑی کہ اس کی روشنی میں مصنف دستوئیفسکی کے تخلیقی عمل کے دو نکتے سامنے آتے ہیں:

ایک یہ کہ وہ اپنے تصورات کے کواڑ بند کیے، تیغا چڑھائے، نفسیاتی گتھیوں میں نہیں اُلجھا رہا بلکہ دن کی دھوپ میں ایک سرگرم سماجی شخصیت کی حیثیت سے نکلا اور انجانے لوگوں کی حمایت میں ایک فریق بنا؛

دوسرے یہ کہ تخیل نے واقعات پر قیاس کا عمل کیا، قیاس نے اسے ایک اہم تجربے کی راہ دکھائی اور چھان بین سے پتہ چلا کہ قیاس کی آنکھ نے جو دیکھا تھا، واقعات اس کی کہاں تک گواہی دیتے ہیں! کہاں کس قسم کی غلطی ہو سکتی ہے!

افسانہ یا ناول کا مصنّف ذہنی اُپج کے لحاظ سے شاعر ہے جو تخیّل کے پروں سے پرواز کرتا ہے مگر تخیّل کو حقیقت کی غذا ملتی رہے، تب ٹھوس تجربے سے جسمانی یا ذہنی قربت ہی اُس کی ضمانت ہے۔ مردم بےزاری میں نام پانے والے دستوئیفسکی نے ہمیشہ یہ قربت بنائے رکھی۔

معمولی سے مشاہدے کو تخیّل اور قیاس کہاں کہاں لیے پھرتے ہیں، شعور اور تحت الشعور میں کیا نسبت رہتی ہے اور کیوں کر زندگی کے بکھرے ہوئے تجربات سے تخیّل غذا پاتا ہے، اسے جاننے کے لئے ہم پھر "مصنّف کی ڈائری" سے رجوع کرتے ہیں۔

.......ایک راہ گیر پر نظر پڑتی ہے، ملازمت پیشہ آدمی ہے۔ بیوی ساتھ نہیں جو بازو کا سہارا لیے ہو، ایک چھوٹا سا بچّہ ساتھ چل رہا ہے۔ دونوں اُداس اور اکیلے اکیلے دکھائی دیتے ہیں۔ باپ کی عمر ہوگی کوئی ۳۰ سال، چہرہ بے رونق اور کسی قدر بیمار۔ پوشاک اُجلی، جو [اتوار کے] خاص موقع پر نکالی جاتی ہے۔ اُوپر کا کوٹ سلائی پر سے مسکا ہوا، بٹن دُھلائی میں اُدھڑے ہوئے۔ کوٹ کے کالر میلے چیکٹ ہوچکے ہیں۔ پتلون نسبتاً زیادہ صاف۔ مگر دیکھتے ہی خیال گزرتا ہے کہ پُرانے مال کی دوکان سے لیا ہوگا۔ لمبا اونچا ہیٹ بالکل ہی بدوضع سا۔ ہو نہ ہو، یہ شخص پرنٹر ہوگا۔ صورت پر سختی، بے لطفی اور مایوسی برستی ہے۔ لڑکے کا ہاتھ تھامے چل رہا ہے، لڑکا پیچھے گھسٹتا ہے۔ عمر ہوگی ۲ سال۔ لڑکے کا حلیہ دکھانے کے بعد مصنّف قیاس کی ڈور اور ڈھیلی کرتا ہے؛

باپ اس ننّھے سے بچّے سے کچھ کہتا ہے، شاید ننھی مُنّی ٹانگوں پر اسے چھیڑتا ہوگا۔ بچّہ کچھ جواب نہیں دیتا۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد وہ اسے گود میں اُٹھاکر چلنے لگتا ہے۔ بچّہ خوش ہوکر باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے.........

"...... مجھے راہ گیروں کو تکنا پسند ہے۔ ان کے اجنبی چہروں پر غور کرنا، انھیں شناخت کرنے کے لئے قیاس دوڑانا، قیافے سے دریافت کرنا کہ ان کی زندگی کیسی ہوگی، زندگی سے انھیں کس طرح کی دل چسپی ہوگی۔ آج میرا قیافہ انھی باپ بیٹے پر لگا ہوا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بچّے کی ماں یعنی اس شخص کی بیوی کا حال میں انتقال ہوا ہے۔ یہ شخص ہفتے کے چھ دن چھپائی کے کارخانے میں کام کرتا ہے اور بچّہ کسی بڑی بی کی نگرانی میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ شاید کسی مکان کے تہہ خانے میں کرائے کے کمرے میں یہ خاندان بسر کرتا ہے اور آج چوں کہ اتوار کی چھٹی ہے تو باپ بن ماں کے بچّے کو کسی رشتہ دار

ہے، غالباً اُس کی خالہ سے ملانے لیے جا رہا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خالہ جس سے کبھی کبھی ملنا ہوتا ہے کسی بے کمیشن فوجی افسر کی بیوی ہوگی اور بارکوں کے پتہ خانے میں مگر الگ کمروں کے مکان میں رہتی ہوگی، تھوڑی دیر کو وہ اپنی مرحومہ بہن کا غم ظاہر کرتی ہے، پھر اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اس کا یہ بہنوئی زیادہ سوگواری نہیں جتاتا خصوصاً اِس موقع پر۔ وہ اپنے حالات پر یوں ہی رسمی سی بات کرتا ہے اور پوچھنے پر چند فقرے بولتا ہے پھر اسے چُپ لگ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ساوراندر لاتے ہیں اور سب مل کر چائے پیتے ہیں۔ بچہ الگ تھلگ ایک کونے میں بنچ پر بیٹھا رہتا ہے، شرمایا ہوا اور خفا خفا۔ آخر اسے نیند کے جھونکے آنے لگتے ہیں۔ خالہ اور خالو دونوں اس کی طرف سے غافل ہیں، سوائے اس کے کہ روٹی کا ٹکڑا اور دودھ کی پیالی ادھر بڑھا دیتے ہیں۔ خالو یوں تو شروع سے چُپ چُپ تھے لیکن ایک دم بھدا سا مذاق سُنانے پر ـــــــ اُتر آتے ہیں اور بچے کو چھیڑتے ہیں۔۔۔۔

باپ اسے [کسی بات پر] ڈانٹنے لگتا ہے۔ بچے کو اب سہار نہیں رہی، وہ یہاں سے چل دینا چاہتا ہے۔ اور باپ اسے لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔

کل سے وہ اپنے کام پر جائے گا اور بچہ پھر اسی بڑی بی کی نگرانی میں سارے دن گھر پر رہے گا"

تخیّل کی قوت خدا داد ہے۔ تاہم اور خدا داد قوتوں کی طرح اسے بنائے رکھنے کے لئے بھی جتن کرنے پڑتے ہیں ـــــ مشاہدے اور نئے سے نئے تجربے کے جتن۔

دستوئیفسکی کے ہم عصر اور مدّاح جرمن اہل قلم نیٹشے نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مشاہدہ صرف مشاہدے کی خاطر نہ ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ پہلے سے ایک خیال قائم کرلیا اور اس کی روشنی میں منظر پر فوکس کر رہے ہیں۔ نفسیات کا مادرزاد تیراک فطری طور سے اس پر مجبور ہے کہ صرف دیکھنے (یا مشاہدہ کرنے) کی خاطر نہ دیکھے۔ یہی بات فطری شاعر پر بھی صادق آتی ہے۔ ایسا آدمی، نیچر میں سے، اپنا کام نہیں کرتا بلکہ اپنی جبلّت پر، قدرتی رجحان پر، اپنے بے نام (camera obscura) کیمرے پر یہ کام چھوڑ دیتا ہے کہ وہ چھانے اور واقعے کو، نیچر (منظر) کو، تجربے کو چھان بین کے بعد سامنے لائے۔ (۹۰-۳)

دستوئیفسکی افسانے یا ناول میں میلوڈراما ئی تاثر پیدا کرنے کی خاطر واقعات کے منطقی بہاؤ کا رُخ نہیں بدلتا، کیمرے کی آنکھ پر یہ کام چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ایک ایک تفصیل سے گزر کر کہیں ٹھہرے اور جہاں ٹھہرے وہاں کا سچا جائزہ لے۔

ناول "جرم وسزا" لکھا جا رہا ہے۔ خاکہ تیار ہے۔ پہلا حصّہ مکمل ہو چکا، چھپ چکا، چھپنے کے چند روز بعد اخباروں میں ایک قتل کی رپورٹ نکلتی ہے کہ ماسکو کے ایک طالب علم نے چیز گروی رکھ کر اُدھار دینے والی کا خون کر دیا۔ حالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے ناول کے شروع میں بیان ہوئے تھے۔ اور یوں واقعے نے مصنّف کے قیاس کی تصدیق کر دی۔

مصنّف آگے چل کر خفیہ پولیس کے انسپکٹر کے بھیس میں طالب علم کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتا ہے۔ پولیس انسپکٹر (Porfiriy) پُرانے وقتوں کا ایک گھاگ ہے۔ جرم کا سراغ لگانے میں انسانی نفسیات کے نکتوں اور کچوکوں سے کام لیتا ہے۔ جن دنوں میں یہ باب لکھا جا رہا تھا مصنّف نے پولیس والوں سے، وکیلوں سے، مقدمات کی جرح اور واردات کی رپورٹوں سے مجرمانہ ذہنیت اور سراغ رسانی کا علم حاصل کیا کہ کہیں بیان میں غلطی یا تخیّل کی ریشہ دوانی راہ نہ پائے، واقعیت قائم رہے۔ اس کی کچّی نوٹ بکیں اور یادداشتیں گواہ ہیں کہ ناول "برادران کراما زوف" کا خیال ۸، ۹ سال دماغ میں پکتا رہا۔ آخر دستوئیفسکی نے اس کو کاغذ پر منتقل کرنے کی ٹھان لی اور اس کام میں تین برس لگانے لیکن کس طرح؟ پہلے کی یادداشتوں پر تراش خراش۔ پھر دوسری فکروں سے بے نیازی۔ ڈائری کی اشاعت روکی تاکہ پوری توجہ اسی ایک کام پر صرف ہو (دسمبر، ۱۸۷۷ء)

"...... ایک ناول میرے دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اب اسے لکھے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔"

سائبیریا کی قید کے زمانے میں وہیں ایک نوجوان ملا تھا؛ پدرکشی کے الزام میں عمر قید کاٹ رہا تھا۔ الیفسکی کئی سال بعد خبر ملی کہ وہ غلط رپورٹ پر ماخوذ ہوا اور مجرم ٹھیرایا گیا تھا۔ مصنّف نے اپنی ڈائری میں یہ بھی درج کیا۔ اور ناول کے ہیرو دیمتری کو اسی سانچے میں ڈھالا کہ آثار اور غلط بیانی کے سبب اُسے پدرکشی کا مجرم ٹھیرایا جاتا ہے۔ ابتدائی خاکے میں تبولسک کا قصبہ جائے واردات ہے (جہاں الیفسکی کا واقعہ ہوا اور جہاں دستوئیفسکی نے قیام کیا تھا) بعد میں وہ جگہ بدل دیتا ہے۔ ناول لکھتے وقت وہ قصبے کا نام بدل کر وہی نام رکھتا ہے جہاں بچپن میں والدین کے ساتھ جایا کرتا تھا "دارووئے" کا گاؤں اور "چرماشنایا" قصبہ۔ اسی جگہ چالیس برس پہلے مصنّف کے باپ کو (جو کراما زوف سے مشابہت رکھتا ہے) رعایا نے انتقاماً قتل کر ڈالا تھا۔

ناول کی تحریر کے لئے قلم اُٹھانے سے پہلے وہ پھر ان دیہات کی سیر کو نکلتا ہے۔ ان کی خصوصیات کچھ کاغذ پر، کچھ حافظے میں لے کر لوٹتا ہے۔ پھر اپنے ایک ٹیچر دوست کو خط لکھتا ہے کہ قصباتی اسکولوں میں بچّوں کی نفسیات اور ان کے برتاؤ پر تفصیلی معلومات درکار ہیں۔ دستوئیفسکی اس ناول میں

بچّوں کی چہل پہل بھی لانے والا تھا۔

ناول میں ایک قصبے کی زندگی ہے اور ایک خانقاہ کی۔ قصبے میں وہ ۵ برس رہ چکا تھا، اور قصباتی زندگی کی تفصیلات جمع کرتا رہا تھا، خانقاہیں دیکھی تھیں، برتی نہیں تھیں۔ اچھی سی کسی خانقاہ (Monastery) کے دورے کی سوچ ہی رہا تھا کہ پہلوٹی کے بیٹے الیوشا کا اچانک انتقال ہو گیا۔ غم زدہ بیوی نے خود بھی سہ دی کہ وہ کسی خانقاہ میں جا کر سکونِ قلب تلاش کرے۔ اِس سے بہت پہلے دستوئیفسکی پر یہی دُھن سوار تھی؛

..... اس خیال کے ہیولیٰ میں وہ تمام چیزیں جذب ہیں جن کے لئے میں آج تک جیا۔ مگر اسے قلم بند کرنے کے لئے مجھے رُوس واپس جانا ہو گا..... کسی خانقاہ کو صرف دیکھ لینا نہیں، بلکہ اس میں کچھ عرصے رہنا پڑے گا...... "

جو خانقاہ اُس نے چُنی — " اوپ تینا پُستین "، وہ پائے تخت اور ریلوے لائن سے دُور ایک سنسان مقام پر تھی؛ ماسکو روانہ ہونے سے قبل اپنے نوجوان فلسفی دوست سلاویوف کو ساتھ لیا۔ ماسکو پر ریل بدلی۔ آخری ریلوے اسٹیشن سے پچاس میل کچی سڑک گھوڑا گاڑی کے دھچکوں میں طے کی اور خانقاہ کے عزلت گزین شیخ (startets) سے دو بار مفصل ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے واپسی پر اور معلومات جمع کیں۔ گویا مصنف کا سامانِ سفر تیار ہو گیا۔

تب جا کے، شہر سے باہر" استاریا روسا" کے ایک صاف ستھرے بنگلے میں سادہ کاغذات اور نیم گرم سماور کے سامنے وہ لیمپ روشن ہوا جس کی روشنی میں مستقبل کا عظیم ناول" برادران کرامازوف" لکھا جانا تھا۔

لکھتے وقت بھی اُسے دُبدھا رہتی تھی کہ کہیں کوئی اشارہ یا تفصیل بے محل تو نہیں — نوٹ بُک میں کچھ اور درج تھا، ناول میں کچھ اور ملتا ہے۔ نوٹ بکوں میں اوّل اور آخر کے بار بار بدلے ہوئے پلان صاف بتاتے ہیں کہ کرداروں کی نفسیات کی رَو میں بے دست و پا بہہ جانا اور کہیں کا کہیں نکل جانا، فن کار کی بے بسی نہیں، بلکہ اس کے نزدیک صداقت پسندی کا ایسا تقاضا ہے جس کے آگے فن کار کو سر جُھکا دینا چاہیے۔

...... تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ ممکن ہو گا کہ کوئی شخص ریل کی دونوں پٹریوں کے درمیان، ریل گزرنے کے بعد صحیح سلامت رہ جائے......؟

اس طرح کی تحقیق طلب باتیں اپنی یادداشت میں لکھتا گیا ہے۔ کہیں ان سے کام لیا ہے۔

کہیں خیال ہی ترک کر دیا ہے۔ اور جب تین برس کی مسلسل تلاش اور دو سال کی شب و روز تصنیفی محنت کے بعد ناول پورا کر لیا تب بھی تشنگی برقرار تھی۔ تخیل کو حقیقت کی پوری غذا بہم پہنچانے پر بھی مصنف کی نیت نہیں بھری تھی۔

اسے اپنے حقیقت پسند ہونے پر اصرار تھا اور کچھ بے جا نہیں تھا:

"..... حقیقت اور حقیقت پسندی کا جو میرا تصور ہے۔ وہ ہمارے حقیقت پسند اور ناقد حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ میرا آئیڈیل ازم ان صاحبان کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقی ہے۔ افوہ! خدایا، ہم روسیوں پر، اپنے روحانی نشوونما کے پچھلے دس برس میں (یعنی ۱۸۶۱ء کے بعد سرمایہ دارانہ تباہی کی شروعات میں — ظا) جو کچھ بیت گئی ہے، اسے معقولیت کے ساتھ بیان کر دینا اور پھر اپنے ان حقیقت پسندوں کا طعنہ سننا کہ یہ سب خیال آرائی ہے! ......"

ایک خط میں زور دے کر کہتا ہے:

"....... آرٹ میں حقیقت کیا ہے، اس کے متعلق میں اپنی خاص رائے رکھتا ہوں۔ جس چیز کو اکثریت محض خیال آرائی، اور امر اتفاقی کہتی ہے، بعض اوقات اسی میں میرے نزدیک حقیقت کا جوہر چھپا ہوتا ہے ...... اخبار کے ہر ایک شمارے میں انتہائی سچے اور حیرت انگیز واقعات کی روداد چھپتی ہے، مگر ہمارے ادیب انھیں پروازِ خیال (Fantastic) قرار دے کر ان سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ......

(خطوط جلد دوم۔ شمارہ ۳۲۳)

وسیع مطالعہ

دستوئیفسکی کو اخبار سے بھی سروکار تھا، افکار سے بھی۔ اپنے ہی نہیں دوسروں کے افکار جو قدیم سے قلم بند ہوتے چلے آرہے ہیں۔ مراد ہیں مقدس کتابیں اور نامقدس ادبیات۔

اسکول سے ہی اسے غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن پیٹرسبورگ کے بورڈنگ اسکول میں آنے کے بعد یہ شوق اتنا چمکا کہ وہ ہم سبق لڑکوں میں مردم بے زار، زود رنج اور خشک مزاج شمار ہونے لگا۔

رات گئے وہ ہال کے ایک گوشے میں دھندلی روشنی کے سامنے تنہا بیٹھا کتابوں کے ورق اُلٹا

کرتا۔ یقین کرنا مشکل ہے کہ ملٹری انجینئرنگ اسکول کا ایک کمزور، بیمار سا مفلس طالب علم ۲۰، ۲۱ برس کی عمر تک افسانوی ادب، شاعری، تاریخ اور فلسفہ کا اعلا ذوق پیدا کر چکا تھا۔

ابھی قلم پکڑنا سیکھا ہے کہ سائنسی (علمی) آرٹسٹ بننے کی تمنا بیدار ہوتی ہے، یعنی قلم کار بننے کی، جو فلسفۂ تاریخ کی بنیاد پر اخلاقی سوالوں اور اصولوں کو آرٹ کے لباس میں سجا سکے۔ اسے ابھی سے شاعری، مذہب اور فلسفہ کی سنگت نظر آنے لگی ہے اور وہ اس کی ٹوہ کھوج رہا ہے۔

سرکاری ملازمت ملی (۱۸۴۳ء) تو سرکاری کتب خانہ تک دسترس ہوئی۔ ایک سال پورا کیا ہوگا کہ پڑھنے لکھنے کے لئے وقت کی تنگی کا احساس ہونے لگا۔ ملازمت ترک کردی۔ کتابوں سے لو لگائی۔

پہلا ناول (بچارے لوگ) نکلا تو نکراسوف، بیلنسکی اور گریگروف جیسے نامور ذی علم لوگوں کا حلقہ میسّر آیا۔ مطالعے کے شوق کو مہمیز لگی۔

پیترا شیفسکی حلقے کے اس گروپ نے جو سیاسی ایجی ٹیشن پھیلانے کے لئے خفیہ پریس لگانا چاہتا تھا (۱۸۴۸ء) کتاب سے اس کے تعلقِ خاطر کو دیکھتے ہوئے نوجوان دستوئیفسکی کو اس کام کے لئے چُنا۔

آٹھ مہینے حوالات میں رہنے کے بعد دور دراز سائبریا کی جیل میں پہنچا تو وہاں اخبار، رسالے، کتاب وغیرہ کی سخت مناہی تھی۔ سوائے انجیل (New testament) کے اس ایک کتاب کو وہ لفظ بہ لفظ چاٹ گیا اور جیتے جی اس کا وِرد رکھا۔

بیماری کے وقت جیل کے ہسپتال میں کہیں سے انگریزی ناول Pickwick papers اور David copperfield ہاتھ لگے جو بڑی بے صبری سے پڑھ ڈالے۔

........۱۸۵۴ء میں جب جیل سے رہائی ملی تو اپنے بھائی میخائیل سے پہلا تقاضا کتابوں کا لیا "کتابیں، کتابیں، اور کتابیں" کتابوں کی جو فہرست بھائی کو انتخاب کے لئے بھیجی ہے وہ ایسے شخص کا عجیب اور وحشت انگیز ہَوکا ظاہر کرتی ہے جیسے اندیشہ ہے کہ دماغ ٹھٹھر گیا، جیسے بن پڑے، چار سال کی پیاس ایک ہی بار میں ڈگڈگا کر بجھالے:

> (دیکھو) مجھے یوروپی مورخین، معاشیات کے ماہرین، کلیسا کے بزرگوں کی تحریریں (جہاں تک ممکن ہو قدیم بزرگوں کی ... . پلوٹارک اور دیو دورس Diodorus وغیرہ کی (فلسفیانہ) تصانیف بھجواو۔ فرنچ میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آخر میں یہ کہ قرآن اور ایک جرمن لغت ضرور بھیجنا۔"

وہ فزیکس اور فزیالوجی پر بھی کتابیں منگا رہا ہے ۔ اس سے پہلے کے خط میں (جرمن فلسفی) کانٹ اور ہیگل کی فلسفیانہ تصانیف اور رائج رسالے طلب کر چکا ہے ۔ کتابیں بھیجی گئیں اور وہ ان پر ٹوٹ پڑا تاکہ مطالعے میں جہاں جہاں جھول پڑا ہے اُسے نکالنے کی سبیل کرے ۔ (۶۵-۹)

معاملہ صرف ادبیات اور فلسفے کے مطالعے کا نہیں ، بلکہ روزمرہ کے واقعات سے باخبر رہنے کی بے چینی بھی ہے جو اسے سفر یوروپ کے دوران کسی ایسے مقام پر نہیں ٹھہرنے دیتی جہاں روسی اخبارات نہ آتے ہوں :

"......میں پیچھے رہ جاؤں گا ، صرف وقت سے ہی نہیں ، بلکہ سچ پوچھو تو ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے میرا رابطہ ٹوٹ جائے گا (آپ سے زیادہ مجھے اس کی خبر رہتی ہے کیوں کہ روزانہ بلا ناغہ تین روسی اخبار ایک ایک سطر پڑھتا ہوں ، پھر کچھ تبصروں کے رسالے بھی آجاتے ہیں) زندگی کی دھڑکتی نبض مجھے سنائی نہ دے گی ! فن کارانہ تخلیق پر اس کا کتنا [بُرا] اثر پڑتا ہے !" (۳۹ - ۳)

اسے طرح طرح کے شوق ہیں ، پیلے اور تھیٹر کا شوق ، افسانوی ادب کا فلسفہ اور سیاسیات کا شوق ، عدالتی کارروائیوں کا شوق ، حسینوں کے دیدار کا شوق ، اہلِ علم اور اہلِ قلم سے ملاقاتوں کا شوق ، سائنس کی نئی ترقیوں ، کامیابیوں اور ناکامیوں کو مذہب اور عقیدے کی نسبت سے دیکھنے کا شوق ۔ اور ان سب کی تشفی کے لئے اسے علم ماضی اور عمل حاضر سے باخبر رہنا پڑتا ہے ۔ "تنہائی کی لذت" جس کے وہ گن گاتا ہے ، عموماً مطالعے کی محویت میں ملتی تھی ۔

سائبریا کے اُجڈ فوجی قصبے سے وہ بھائی کو یاد دلاتا ہے :

......قرآن بھیجو ، کانٹ کی تصنیف "عقل محض کی تنقید" بھیجو ، اگر اتفاق سے غیر قانونی ذریعے سے کچھ بھیجنے کا موقع مل جائے تو بھولنا مت ، ہیگل [کی کتاب] بھیج دینا ، خصوصاً ہیگل کی تاریخ فلسفہ ۔ اسی (کتابوں کی وصول یابی) پر میرے پورے مستقبل کا دار و مدار ہے ......

ناول اور ڈرامے لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں مگر ابھی بہت کچھ پڑھنا ہے ....

دستوئیفسکی رہائی اور بحالی کے بعد پیٹرسبورگ سے ورمیا (وقت) رسالہ ایڈٹ کر رہا ہے ، بھائی میخائیل انتظام سنبھالتا ہے ۔ رسالہ سنسرشپ کی زد میں آگیا ۔ اڈیٹر کو گویا منہ مانگی مُراد ملی کہ ایک بار یوروپ کو قریب سے دیکھ لے ، پہچان لے ۔ برلن ، ڈریسڈن ، کولون سے پیرس اور وہاں

سے لندن، پھر گھوم گھام کر جنیوا واپس۔ یہاں ہم مذاق دوست استراخف سے ملنے کا وعدہ تھا۔ وہ بھی آپہنچا۔ دونوں نے ایک ساتھ اٹلی کا سفر کیا۔ فلورنس جیسے دل ربا اور دل کشا مقام پر کہیں وکٹر ہیوگو کے شہرۂ آفاق ناول Les miserables کی تازہ اشاعت کی چار جلدیں نظر آگئیں۔ لے کر قیام گاہ پر پہنچا۔ رفیق سفر نے بہتیرا سمجھایا کہ فلورنس کے قابل دید مقامات بار بار نصیب نہ ہوں گے، باہر نکلو، دیکھو لو، لیکن دستوئیفسکی اپنے پسندیدہ فرنچ مصنف (اور ریفارمر) کی کتابوں میں گم رہا اور ہفتہ بھر میں انھیں گھول کر پی گیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ جو کچھ ہاتھ لگا، پڑھ ڈالا۔ مطالعے کی ایک واضح سمت نظر آتی ہے اس کے ہاں — ایسی کتابیں جو انسان کے مادی اور ذہنی ماضی پر روشنی ڈال سکیں، ایسی کتابیں جو عقیدے اور عمل کے تعلق کا راز جتا سکیں، ایسے اخبار اور رسالے جو روزمرہ کے واقعات اور ملکی وغیر ملکی رودادوں اور تبصروں سے آگاہ کریں۔

یوروپ کے تین سفر بھی مطالعے، تلاش اور تجربے کی نیت لیے ہوئے تھے — اور بے مصرف نہیں رہے۔ آدمی (فردِ واحد)، زمان و مکان کی خاص حدوں میں بسر کرنے والے موجود آدمی کا، اور پچھلے آدمی کی حاصل تلاش کا مطالعہ اکتساب تھا اور خود مصنف کی ذہنی اپج، تخیل کی قوت خداداد۔ ان دونوں کا ایسا ساتھ ہوا ہے کہ استراخف کے بیان کے مطابق

> اشیا کی ماہیت اور اس پر ہمارے علم کے حدود وہ موضوع تھے جن میں دستوئیفسکی الجھا رہتا تھا، اور جب کبھی اسے جتایا جاتا کہ فلسفے کی تاریخ میں کہیں نہ کہیں تقریباً ویسے ہی فلسفیانہ خیالات مل جاتے ہیں جیسے دستوئیفسکی کی زبانی ادا ہوئے۔ یوں کسی نئے نظام فلسفہ یا فلسفیانہ تصور کی ایجاد بہت مشکل ہے — تو وہ ہنس کر کہتا کہ بہ الفاظِ دیگر میرے خیالات کا کسی نہ کسی عظیم مفکر سے توارد ہوتا رہتا ہے۔

توارد کی یہ صورت دنیا کے صرف عظیم مفکروں کے خیالات کے ساتھ ہی پیش نہیں آئی بلکہ جو کیرکٹر اس نے تراشے (اور ان کی تعداد ۳۰ سے کسی طرح کم نہیں) ان کی گفتار، کردار اور افکار میں بھی دستوئیفسکی کسی نہ کسی حد تک روپ بدل بدل کر شریک ہے۔ منظر اس نے وہی رکھے جن میں خود بسر کر چکا تھا، کردار ویسے چنے جن سے بے تکلفی برت چکا تھا اور بحث ان واقعات، واردات اور خیالات پر کی (کہیں مدعی بن کر، کہیں مدعا علیہ بن کر) جن کو خوب چھان کر جسم و جان کا جزو بنا چکا تھا۔

جنوٗن

دستوئیفسکی کے سلسلے میں یہ ضمنی عنوان اس لئے مناسب ہے کہ تصنیفی سرگرمی اُس پر جنوٗن کی طرح سوار ہوتی ہے، ایسا جنون جو باقی تمام کلفتوں اور ذلتوں کا تنہا توڑ ہے

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

جن دنوں دستوئیفسکی وطن سے دوٗر، ڈریسڈن میں بیٹھا "بھوت پریت" لکھنے میں محو، اور اپنے آپ سے دست و گریبان تھا اپنے دوست مائیکوف کو لکھتا ہے:

"...سخت مشکل میں ہوں۔ بات نہیں بن رہی۔ دنیا میں کسی چیز سے اتنا بےزار نہیں ہوں جتنا ادبی کام سے۔ یعنی خود اپنے ناول اور افسانہ نگاری سے ...ہمیشہ ایسا موضوع اُٹھاتا ہوں جو میری گرفت سے باہر ہو۔ لہٰذا اسے تباہ کر کے چھوڑوں گا......... (۱۲ راکتوبر ۱۸۷۰ء)

...... مجھے چند خیالات کا اظہار مقصود ہے، چاہے [اس ناول کا] فن کارانہ پہلو تباہ ہو جائے یا باقی رہے........ اگر یہ [ناول] پمفلٹ ہو کر رہ جائے تب بھی وہ سب کہہ کے رہوں گا جو میرے دل میں ہے........"

انقلاب اکتوبر (۱۹۱۷ء) سے پہلے نوجوان روسی انقلابیوں نے اس ناول کو کنڈم کر دیا اور انقلاب کے بعد "اشتراکی حقیقت نگاری" کے نقیب میکسم گوٗرکی نے اسی ناول پر دستوئیفسکی کو گمراہ کہا۔ ایک زمانے تک کسی روشن خیال حلقے نے بھی یہ ناول گلے نہیں اُتارا یہاں تک کہ خود مصنف پر غم و غصہ کا دورہ پڑا ــــ حقیقت یہ ہے کہ دستوئیفسکی نے اس ناول کے لکھنے میں (جو بدترین مصائب کے دنوں میں لکھا گیا) جان جوکھم میں ڈالی اور یہ سوچ کر کہ وہ اپنے ہم قلم اور پہلے کے ہم نواؤں میں مطعون، معتوب اور مردوٗد قرار پائے گا۔ قلم کو نشتر بنا کر پوست کندہ دکھا دیا کہ باغیانہ تحریک در پردہ نہیں رہ سکتی اور اسے محض سازشی نہ ہونا چاہیے۔ لوگوں کی بڑی اکثریت کا کھلا فیصلہ بنے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ سازشی گردہوں کی صورت میں مادر پدر آزاد، بداندیش اور بےدرد ہتیاروں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

اس نے اپنی نوجوانی جیل سے پہلے اور جیل کے اندر ایسے کرداروں کے ساتھ گزاری تھی ؛ وہ اندر تک نہلسٹوں (Nihilist) اور نارکسٹوں (anarchist) کے تانے بانے سے باخبر تھا۔ تورگینیف، نکراسوف اور تالستائی کے لیے یہ سب سُنی سنائی باتیں تھیں، دستوئیفسکی کے لیے برتی ہوئی۔ اسی کا حق تھا اچھوتے موضوع پر قلم اُٹھانے کا۔

اُنھی دنوں باکونین (منکر رہ نما) کے شاگرد نشچائیف کا واقعہ منظرِ عام پر آیا۔ جس کے اشارے سے ماسکو کے ایک طالب علم آیوانوف کو (غداری کے شبہ میں) تالاب میں ڈبو کر مار ڈالا گیا اور سیاسی قاتل جنیوا فرار کر گیا ــ جہاں سے گرفتار کر کے لایا گیا اور اقبالِ جرم کے ساتھ اُس نے خودکشی کر لی۔

دستوئیفسکی تب تک اپنی اس رائے پر اٹل ہو چکا تھا کہ وہ شخص انقلابی رہ نمائی تو کیا انسانی معاشرے کے لیے خطرناک ہے

"جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا"

۱۹ ویں صدی نے "بھوت پریت" (Devils) سے زیادہ کڑوا سیاسی ناول نہیں پایا ، اور دستوئیفسکی سے زیادہ بدنصیب مصنّف نہیں دیکھا جسے اپنے عظیم الشان کارنامے پر جیتے جی بیداد کے سوا کچھ نہ ملا۔ محض ایک جنون تھا اپنی جچی تُلی رائے کو، اُس فکر کو جو پورے وجود میں پیوست ہو چکی، جذبہ بن چکی، آرٹ کے رُوپ میں منظرِ عام پر لانے کا۔ وہ دَرانہ یہ کام کر گزرا۔ چاروں بڑے ناول اسی شدّت و حدّت کے عالم میں لکھے گئے ہیں۔

بہ ظاہر یہ ریمارک ناولسٹ دستوئیفسکی کے خلاف پڑتا ہے کہ اُس نے کردار تراشے ہیں خیالات کی بار برداری کے لیے۔ لیکن سوچنا چاہیے کہ وہ خیالات کیا اس ہستی میں رس بس نہیں گئے تھے ؟

دستوئیفسکی بڑے طمطراق سے کہتا ہے کہ میں آرٹ کی خاطر آرٹ کو نہیں مانتا۔ وہ بے سبب اور بے مقصد تحریر کو، چاہے کتنی ہی دل کش کیوں نہ ہو، بے اثر کہتا ہے اور اس کے آرٹ ہونے سے بھی مُنکر ہے۔

اہلِ فکر اور اہلِ قلم پر زندگی ایک فرض عائد کرتی ہے، یہ فرض تبھی ادا ہو سکتا ہے کہ اظہار کی قدرت رکھنے والا، اظہار کے جنون میں مبتلا ہو، ماسوا سے بے نیاز ہو کر لکھے۔ اظہار کا

جنون دستوئیفسکی کے ہاں اُس کے عشق کی طرح بے تحاشا اور بے محابا ہو چکا تھا۔ عاشق کی طرح ایک ایسی آزار طلبی جس کی لذت لئے بغیر وہ جی نہیں سکتا تھا۔

گوہر بحر خیزد و معنی ز فکرِ ژرف
بر ما خراجِ طبع روانے نہادہ اند

وہ ایک ضدی آدمی تھا — یہ ضد اس کے فن کو راس آئی۔

اسی ہم خیال دوست مائیکوف کو لکھتا ہے:

...... بدترین بات یہ ہے کہ میری فطرت بگڑی ہوئی ہے، شدّتِ جذبات میں کہیں رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ ہر جگہ اور ہر معاملے میں انتہا کو پہنچ جاتا ہوں۔ ساری عمر، بس انتہا کر ڈالنے میں ہی گزری ہے .... (۱۸۶۷ء)

بیوی کی ڈائری اور "یادوں" میں اس کی جنونی ضد کی پے در پے کئی واقعے درج ہیں۔ مثلاً: دونوں میاں بیوی ڈریسڈن آرٹ گیلری دیکھنے پہنچے۔ شوہر کی دور کی نظر کمزور ہے، چشمہ ہے نہیں، دُھن سمائی کہ میڈونا کی (شاہ کار) تصویر کرسی پر چڑھ کر نزدیک سے دیکھوں گا .... ایک نگراں آیا اور کرسی پر چڑھنے کو منع کر گیا۔ بیوی نے روکا، سمجھایا مگر وہ پھر کرسی پر چڑھا، "میری بلا سے، چاہے وہ مجھے یہاں سے نکال دیں، میں نزدیک سے دیکھنا چاہتا ہوں، اگر تمھیں گوارا نہیں، تم بھی چلی جاؤ — دوسرے کمرے میں "— آخر اپنی ضد پوری کر کے رہا۔

جوئے کی لت بھی اسی جنونی ضد کا ایک پہلو تھی۔

یوروپ کے دوسرے دَورے میں، جب وہ پہلی بیوی کو بیمار چھوڑ کر بے تابانہ وطن سے نکلا ہے (اگست ۱۸۶۳ء) تو اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ جرمن جُوا نگری (وائس بیڈن) میں بڑی رقم جیت کر سارے قرضوں سے یک مُشت نجات پا لوں گا۔ وہ وقت نہ آنا تھا نہ آیا، پھر بھی اصرار ہے، پھر بھی آخری سکّہ تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔

تیسری بار پھر کم عمر اور چہیتی بیوی کو وہیں لے کر پہنچتا ہے۔ دیوانہ وار ہارتا چلا جاتا ہے۔ کل کی روٹی کا آسرا نہیں، کوئی ہمدرد اور اُدھار دوال نہیں۔

......سب کچھ ہار کر آ گیا اور پھر [مجھے تھپکنے اور بہلانے کے بعد] بولا کہ سب خیر ہے، صرف سات لوئیز (سکّے) گھر میں رہ جائیں گے اور گزر بسر کا کوئی سامان نہ ہوگا، تاہم کوئی صورت

نظر نہیں آتی۔ کسی طرح قرار نہیں آرہا۔ بس ایک ہی راستہ ہے۔ اگر میں نے سات میں سے پانچ لوئنز فوراً نہ دے ڈالے تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ سراسیمگی طاری تھی اس پر....."

یہی ہول ناک حالت وطن سے باہر نکلنے اور پھر وطن واپس جانے کے لیے ہوا کرتی تھی ———

بیوی نے چار برس کی دربدری میں بھانپ لیا کہ ایک جنون کا توڑ دوسرا جنون۔ یعنی جہاں تک وہ ہار جیت کے کھیل میں ہارتا جائے۔ ہارے، اس پر کوئی روک نہ لگے۔ کانوں کے بندے، شادی کی انگوٹھی اور گھر کے برتن بھانڈے، یہاں تک کہ کپڑے بھی گروی رکھنے اور ہار چکنے کے بعد اس پر پشیمانی کا دورہ پڑتا۔ اسے چپ لگ جاتی اور وہ قلم دان جھاڑ پونچھ کر، شمع جلا کر، سماور سلگا کر ایک کمرے میں بیٹھ جاتا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں نوٹ تیار کرنے میں راتوں کو لگاتار صبح کیا کرتا۔ دوسرے دن بیوی شارٹ ہینڈ لکھتی اور پھر صاف کاپی بنا کر سامنے رکھ دیتی۔ بعض اوقات اصل تصنیف کی رفتار نقل و تسوید سے کہیں تیز ہوتی تھی۔

بیوی مطمئن کہ جنون کو صحیح راہ پر لگا دیا۔ مصنف مطمئن کہ پچھلے تمام نقصان کی تلافی کرنی ہے۔

دستوئیفسکی کے اس جنون کو، جس نے اُسے عظیم فن کار بنانے میں حصہ لیا، تین سمتوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

(۱) ایک مرگی کا مرض اور سخت گیر باپ کا رعیت کے ہاتھوں بے رحمانہ قتل۔

سگمنڈ فرائڈ نے ایک عالمانہ مقالے [دستوئیفسکی اور پدر کشی] میں ان دونوں واقعات کو اس کی قمار بازی کے ساتھ ایک رشتے میں پرو کر یہ واضح کیا ہے کہ باپ سے نفرت اور باپ سے محبت دونوں جبلتوں کے کچلے جانے کے کارن آزار طلبی اور اذیت پسندی طبیعت کا خاصہ بن جاتی ہے۔ اعصابی تشنج کا شدید حملہ اسے اظہار کی وہ شکل دیتا ہے جسے ہم "مرگی" کہتے ہیں۔

...... یوں مرگی کا دورہ، ہسٹیریا (ہیجان) کی ایک علامت بن جاتا ہے اور اسے کم و بیش کر کے اپنے سانچے میں اسی طرح ڈھال لیتا ہے جیسے وہ نارمل جنسی فعل کے آخر تک پہنچنے کو اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا ہم قطعی حق بجانب ہوں گے اگر مرگی اور مرگی میں فرق کریں، ایک ہے اندرونی جسمانی [تشنج] (organic)، اور ایک ہے باہر کا غلبہ (affective)

پہلی قسم [مرگی] کا مریض دماغی مرض میں مبتلا ہوتا ہے، دوسری قسم کا مریض اعصابی ہیجان

(Neurosis) کا شکار۔

"......اوّل میں دماغی زندگی باہر سے کسی اجنبی خلفشار کے اثر میں رہتی ہے اور دوسرے کیس میں یہ خلفشار ہی بجائے خود اس کی دماغی زندگی کا اظہار بن جاتا ہے۔

یہیں فرائڈ کے حاشیے میں ایک اور اہم حوالہ ملتا ہے :

"...... وہ (دستوئیفسکی) جوئے کی میز پر تب تک لگا رہتا تھا جب تک سب کچھ ہار کر بالکل قلاّش نہ ہو جائے۔ جب تباہی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تو بھوت اُس کے سر سے اتر جاتا اور [مصنّف کی] تخلیقی جی نی یس کے لئے جگہ خالی کر دیتا۔"

(Fiilop. Miller and Ekstien – 1925, lxxxvi)

(۲) فلسفہ اور تمدّن کی تاریخ اور اپنے وسیع مشاہدات کی روشنی میں دستوئیفسکی کا رائج نظریات عقلیت (Rationalism) اور افادیت (utalitanarism) کے توڑ پر، یہ اصول یا کلیّہ اخذ کرنا کہ :

(۱) انسان اپنے اختیار یا آزادانہ عمل کا ثبوت دینے کے لئے مرا جاتا ہے؛ اس سے بڑھ کر اور کوئی خواہش انسانی قول و فعل پر حاوی نہیں، چاہے یہ خواہش اُس کے لئے زہر قاتل ہی کیوں نہ نکلے،

(ب) انسانی تمدّن بہرحال ذاتی مفاد اور عقلی ثبوت یا معقولیت پر قائم نہیں۔ انسانی فطرت اتنی سادہ نہیں کہ جس بات کی قائل ہو جائے وہی کرنے لگے۔ انسان بنیادی طور پر معقولیت کے خلاف (Irrational) جاتا ہے، اگر معقولیت اُس کے جذبۂ بے اختیار کے خلاف پڑتی ہو۔ ("زیرِ زمین آدمی کی یادداشتیں" انہی نکات پر زور دیتی ہیں)

تحریر و تصنیف کے کام کو بھی وہ مادّی نقصان سمجھ کر سینے سے لگاتا ہے اور جب اس جنون میں مبتلا ہوتا ہے تو کنارے کی ساری کشتیاں جلا ڈالتا ہے۔ پہلی سرکاری ملازمت سے لے کر اچھی تنخواہ کی ایڈیٹری (۲۳، ۱۸۷۳ء) تک وہ میز چھوڑ کر اُٹھ گیا کہ ایڈیٹری اور ادبی تصنیف و تالیف کا ساتھ نہیں دونوں میں رقابت چلتی ہے۔

انہی دنوں اپنی بیوی کو لکھتا ہے :

"......اگر میں ان لوگوں کی رائے (نظریے) سے ہٹ کر کچھ لکھ جاؤں تو نکراسوف مجھے تنگ کرے گا...... لیکن اگر ہمیں بھیک مانگنے کی نوبت بھی آ جائے تو میں

(اپنی رائے سے) ایک اینچ ہٹنے والا نہیں ہوں......"

(۳) نیک دل، دُکھی اور محروم آدمی کا درد مصنّف کے رگ وپے میں اس درجہ سرایت کرگیا ہے کہ ہر پہلو سے اس کی حمایت ایک عقیدہ، جزوِ ایمان، بلکہ تمام تر ایمان بن چکی ہے۔ اور وہ قلم کو پرچم بنالینے پر مجبور کرتی ہے۔ لکھنا اس کے لیے پیشہ نہیں (اگرچہ روسی نثر نگاروں میں وہ پہلا شخص تھا جس نے اسی کو واحد پیشہ اور ذریعۂ معاش بنایا) لکھنا دستوئیفسکی کی پوری شخصیت کا تقاضا ہے۔ چناں چہ جب اُسے یہ احساس ہونے لگا کہ روز بروز تصنیفی محنت دشوار ہوتی جارہی ہے تو ساتھ ہی وہ سمجھ گیا کہ سانس کی لَو بھڑک کر بجھا چاہتی ہے۔ یوں ہی ہوا بھی۔

اس کے معاصرین بلکہ ہمسر خوش حال لوگ تھے: گنچروف، گری گورے وچ، نکراسوف، تورگنیف، اور تالستائی نے کسانوں اور سادہ دل بندوں کی حمایت میں قلم اُٹھایا تو گویا ایک فاصلہ طے کرکے، اپنے طبقے اور ماحول میں رہ کر اور اس کے مفاد سے منہ موڑ کر۔ دستوئیفسکی نے ہر ایک دُکھ اپنی کھال پر سہا۔ مفلس نوجوانی کا دُکھ، بے زبان کلرک کا دُکھ؛ باپ کی جھڑکیوں کا دُکھ؛ نوجوان سیاسی کارکنوں کی خوش فہمی، سازشی اور تنگ ذہنی رفیقوں کے حیلے حوالے، سزائے موت اور ٹکٹکی اور پھر زندگی کا فرمان۔ انتہائی سقیم جیل خانے میں دہشت پسندوں، بھوکے آدمیوں، پیشہ ور مجرموں کی ٹانگ سے ٹانگ باندھ کر چار برس مشقت، ایشیائی اُجاڑ قصبے میں روسی فوجی تسلّط کا ماحول۔ اور پھر ایک کے بعد ایک ستم پیشہ عشق، یوروپ میں رسوائی کے سامان، دو دو دن کا فاقہ، نادہند قرضدار کی حیثیت سے جیل کی ہمہ وقت پرچھائیں —— یہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ —— وہ کچھ غلط نہیں کہتا تھا کہ تورگنیف کو مجھ سے دُگنی رائلٹی دی جاتی ہے لیکن میں جس کرب میں لکھتا ہوں، تورگنیف یوں دو ورق لکھے تو کلیجہ منہ کو آجائے۔

اُس نے مریض، مجرم، ٹیڑھے میڑھے کرداروں کو برتا اور آدمی کی دُکھی آتما میں اتنا نزدیک سے جھانک کر دیکھا کہ اسے بشر کی ہستی میں اندرونی تضاد کی جدلیات صاف نظر آگئیں اور اسی کے ساتھ اپنی ہستی کی بھی۔

لازم ہے کہ ایسے ماحول اور ایسے کرداروں کی تصویر کشی اور نفسیاتی تحلیل کی خاطر اُسے خود غیر معمولی ذہنی کیفیت اور شدید ہیجان میں بسر کرنا اور اس سے گزرنا پڑتا تھا۔

اس کا ہر ایک اہم ناول، دغا، فریب، اصل کردار کی اچانک اُلٹ پلٹ، خودکشی ورنہ قتل کی تفصیلات سے بوجھل اور ہیجان انگیز ہے، مصنّف کی طرح پڑھنے والے کی بھی نیندیں اُڑا دیتا ہے۔ پھر بھی

اسے خود سے گلہ ہے کہ موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرسکا۔

موت سے چند ہفتہ پہلے وہ ایک صاحب زادی کے سوال کے جواب میں لکھتا ہے۔
"......کوئی اور کیا بتائے گا، میں خود بحیثیت مصنف اپنی بہت سی کوتاہیوں سے واقف ہوں اپنے کام سے خود نامطمئن ہوں۔ تصور کیجیے کہ جب اپنے آپ سے جرح کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جتنا کچھ دماغ میں تھا، اور غالباً لکھا جاسکتا تھا، اُس کا ۲۰ واں حصّہ بھی نہ لکھ سکا۔ اب میری نجات کی ایک ہی سبیل ہے: اور وہ یہ آس باندھنا کہ ایک نہ ایک دن خدا مجھے توفیق دے کہ اپنی بات پوری طرح کہہ سکوں اور یہ قدرت نصیب ہو کہ دل اور تخیل کا سارا بار اُتار کر صاف لفظوں میں رکھ دوں......" (۲۵-۱۳)

اُن کا سب سے اہم اور آخری ناول "برادران کرامازوف" زندگی اور ذلتوں کے مارے بندوں کے حق میں کسی مفکّر کی ایک چیخ بن گیا ہے۔ یہ فلسفیانہ، نفسیاتی اور نہایت گٹھیلا ناول مصنّف کی شدّتِ جذبات کا بھی ویسا ہی شاہ کار ہے جیسے اُس کے خیالات کا نچوڑ۔ جس دن وہ اس سے مطمئن ہوا موت نے سرگوشی کی کہ مصنّف اور فن کار اپنے جنون کا حق ادا کرچکا، اب زندگی سے رخصت طلب کرے۔

طرزِ بیان

دستوئیفسکی کو اکثر (بہ قولِ جوش) یہ شکوہ رہا:

انسوس کہ تُرش ہو گیا شہدِ خیال
الفاظ کی بوتلوں میں آتے آتے

یعنی جیسا اہتم بالشان یا گمبھیر "خیال" لے کر چلا تھا، ویسا "پیکر" نہ دے سکا۔ بیان پھیکا بلکہ ادھورا رہ گیا۔

فن کار کے اس درد کو، بعض لکھنے والوں نے لغوی معنی میں سمجھا اور یہ نتیجہ نکال لیا کہ وہ "خیال" کا ادیب ہے زبان کا نہیں۔ زبان اس کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہے یہاں تک کہ کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت اصل اور نقل میں فرق نہیں پڑتا۔

اوّل تو دستوئیفسکی کے مسودے جو دس دس ترمیموں سے گزرے ہیں، اس بیان کے جھٹلانے کو کافی ہیں۔ دوسرے جن لوگوں نے ۱۹ ویں صدی کی روسی نثر کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور دستوئیفسکی کے طرزِ بیان کی چکّردار سیڑھی سے اندر تک اترنے کی کوشش کی ہے، مثلاً لیونڈ گراسمین[۱] وہ گواہ ہیں کہ عالمی ادب میں پہلے فلسفیانہ، نفسیاتی اور ایکشن ناول دینے میں دستوئیفسکی کو ایسی زبان تراشنی پڑی جس سے روسی افسانوی ادب ناآشنا تھا۔

دستوئیفسکی کے یہاں اہم کردار اتنے تضادوں کے ملاپ پر تراشے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کا دھیان لفظوں اور جملوں کے جوڑ کی طرف نہیں جاتا۔[۲] یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے ورق اُلٹتے ہی کیا سے کیا ہو جائے گا ــــــ اور پھر ورق پر ورق اُلٹتے جائیے، ممکن ہے بے لطف خود کلامی چل رہی ہو ــــ اور واقعہ وہیں رُکا ہوا ہو ــــــ ناول "ایڈیٹ" کا پہلا دن ۱۸۰ صفحے تک چلا گیا ہے اور کُل چار منظر ہیں۔

(۱) ...... دستوئیفسکی نے انسان کی زندگی بھی دیکھی تھی اس کی نیکی بھی، چناں چہ اس کا دنیا کی تجربہ اور ویسے ہی اس کا طرزِ بیان دونوں تضادوں سے بنے ہوئے ہیں ......"

(۱۸۳ — ۷)

(۲) روسی تنقیدی ادب میں صفِ اوّل کے لکھنے والوں پر ایک سلسلۂ مضامین ہے "پوئے تیکا" کے نام سے۔ یہ تنقیدی مقالے کتابی سیریز میں شائع ہوئے ہیں۔

لیونڈ گراسمین L. Grossman کی تصنیف "پوئے تیکا دستوئیفسکو" ۱۹۲۵ء میں ماسکو سے نکلی تھی اور آج تک دستوئیفسکی کے طرزِ بیان پر حرفِ آخر شمار ہوتی ہے۔

بظاہر اس شکست، روی کے باوجود، اُس کی افسانوی تحریریں رُوحانی کشاکش اور انہونے حادثوں سے کچھ اس طرح پٹی پڑی ہیں کہ ان پر سخت تناؤ کے ڈرامے کا گمان ہوتا ہے، ایسا ڈرامہ جس میں منظر بدلے بغیر بھی خارجی اور داخلی ایکشن کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں اس کا کوئی ناول یا ناولٹ نہیں بچا جس نے ڈرامے کا رُوپ نہ پایا ہو اور ناول کو ڈرامہ یا ڈرامائی فلم کا رُوپ دینے میں بہت اَدل بَدل کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

اس کا حریف معاصر تورگنیف "فرنچ ہمسروں کی طرح بیان کو بنا تا سنوارتا ہے، لفظوں کی مانگ چوٹی کرتا ہے، دستوئیفسکی اس کے برخلاف ہے۔ وہ جب خود اپنی زبان سے کچھ کہتا ہے تو جملوں کی زلفِ دراز اور بکھیر دیتا ہے اور جب کرداروں کی زبانی بولتا ہے تو یوں گویا پردے کے پیچھے کسی پرومپٹر لقمہ دینے والے کا وجود ہی نہیں۔ ہر ایک کردار اپنی عمر، مزاج، تعلیم اور نفس مضمون کے تقاضے سے خود بخود کلام کر رہا ہے۔

چٹ پٹے، پُرلطف ناولوں کا عادی دستوئیفسکی کے طرزِ بیان کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ "بھوت پریت" میں ایک خلوت پسند، خانقاہ نشین پادری تخوَن کے پاس گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا خود پسند استاوروگن پہنچتا ہے اور اپنا سیاہ اعمال نامہ (اعتراف یا "کن فے شن") ساتھ لے گیا ہے۔ اس میں ایک نابالغ بچی سے زنا بالجبر کا اقرار بھی شامل ہے۔ نیک دل پادری ٹھنڈے دل سے اعمال نامہ پڑھ لیتا ہے اور بے لطف ہوتا ہے —— استاوروگن پوچھتا ہے:

"بتائیے، آپ میں صاف بات کہنے کی، ویسے تو، بڑی صلاحیت ہے نا، صاف بولیے!"

"یہ جو آپ نے اعتراف نامہ (توبہ نامہ) لکھا ہے، خود اس کی ساخت میں کوئی مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ اس کی ساخت (یا فارم) مضحکہ خیز ہے؟" وہ اُلجھنے کے لہجے میں بولا

جی ہاں اور اصل مضمون بھی۔ بھدّاپن قاتل ہوتا ہے۔" تخون نے دبی آواز میں، نظر نیچی کر کے کہا۔

"بھدّاپن؟ کیا کہا؟ بھدّاپن؟"

"جی ہاں، جُرم کا بدوضع ہونا۔"

ہم چند جملوں میں متقابل کی دونوں شخصیتوں کو خوب پہچان لیتے ہیں ایک روحانی طور پر گہرا اور خوش مذاق شخص ہے جسے دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں، دوسرا خود پسند اور خود نگر شخص ہے جسے اپنی دنیاوی وجاہت اور اخلاقی جرأت، دونوں کا غرّہ ہے۔ دونوں کا لہجہ، زبان، جملوں کی ساخت الگ الگ ہے۔

یہی حال اور ناولوں کا ہے جس میں کرداروں کی زبان ایک دوسرے سے جُدا ہے اور طرز ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرے ہیں۔

ہر ایک بڑے مصنف کو کچھ خاص قسم کی ترکیبیں، کچھ بندشیں، محاورے، علامات اور استعارے عزیز ہوتے ہیں، دستوئیفسکی کو تو یوں بھی علامت نگار (Symbolist) کہا گیا ہے اور روسی ادب میں علامت نگاری کے مکتب فکر نے اسے اپنا امام مانا ہے، تاہم اندازِ بیان کی راہ سے ہم اسے تبھی شناخت کرسکتے ہیں جب یہ مان لیں کہ وہ کسی مخصوص طرز کو اپنانے یا چلانے پر اصرار نہیں کرتا۔

روسی سبک شناس باختن (Bakhtin) نے دستوئیفسکی کے طرزِ بیان کی تلاش میں یہ نکتہ دریافت کیا ہے کہ اس کے ہاں مکالموں میں تہیں ہوتی ہیں۔ ایک کردار کی گفتگو دوسرے کردار کی زبان پر آنے والے جواب (یا گفتگو) کا پردہ سرکاتی جاتی ہے —— اور اسے شہ دیتی ہے۔ مثلاً "زیرِ زمین آدمی کی یادداشتیں" میں کردار ایک ہے —— واحد متکلم لیکن آوازیں تین: مونولاگ، ڈائی لاگ بنتا ہے۔ دو اندرونی آوازیں باہم مخاطب رہتی ہیں اور پھر دونوں مل کر پڑھنے والے سے بات کرتی جاتی ہیں۔

باختن نے مثالوں سے یہ نکتہ واضح کیا ہے اور رابرٹ لارڈ (R. Lord) نے اس تجزیے کو قبول کرتے ہوئے اس پر "ذوق" اور "شخصیت" کے دو اہم پہلوؤں کا اضافہ کیا ہے۔

دستوئیفسکی کے ذوق اور شخصیت کی طرح اس کے طرزِ بیان کا معاملہ بھی سیدھا سادہ نہیں ہے۔ رابرٹ لارڈ کے تبصرے کا خلاصہ اسی کے لفظوں میں یوں ہوگا:

"دستوئیفسکی اکثر اخباری اسٹائل کی طرف اپنا جھکاؤ دکھاتا ہے اور روزمرّہ کی زندگی سے مٹھی بھر بھر چالو قصّے [ادب میں] بکھیر دینے میں شاید ہی کبھی ہچکچایا ہو۔ باختن تو اس پر بھی آمادہ ہے کہ ایک سرے سے دستوئیفسکی کے پورے طرزِ بیان کو نیوز پرنٹ کی دنیا میں شمار کرے۔ 'نیوز پیپر سے اس کو اُنس ہے، اخباری پرچے کو وہ گہرائی تک نزاکت کے ساتھ سمجھتا ہے کہ وہ گویا منھ بولتی پرچھائیں ہے، ایک ہی دن میں بالکل مختلف لوگوں کے عصری سماجی مناظر کے باہمی تضادوں؛ وقت اس کے ہاں حال میں موجود ہے؛ ماضی صرف عہد رفتہ کے ورق اُلٹنے (Flashback) میں سامنے آتا ہے۔' یوں سمجھیے کہ ناول بڑے بڑے اخبار ہیں جن میں ہر ایک کردار اپنی طرف سے کُل میں اپنا حصّہ بڑھاتا جاتا ہے۔"
(۲۰۹ - ۱۲)

دستوئیفسکی کے طرزِ بیان کو خبرناموں یا اخباروں کے انداز پر بتانا مصنف کی توہین شمار ہوتا، لیکن اوّل تو خود مصنّف کو اپنے جرنلسٹ ہونے سے انکار نہیں، اس نے کم از کم تین بار یہ پیشہ اپنایا، دوسرے یہ کہ اخباری روداد کی طرح یہاں بھی کردار کی نوعیت اور واقعے کی حیثیت کے مطابق بیان بدلتا رہتا ہے۔

"ایڈیٹ" جیسا بھاری بھرکم، چونکانے والا ناول، جس میں چھ کے چھ اہم کیرکٹر اپنی اپنی نقیض لیے گھوم رہے ہیں، اور ان سب کے پسِ منظر میں اُبھرتا ہے، دستوئیفسکی کا پسندیدہ مخلوق پرنس میشکن (Myshkin) ناول کا نوجوان ہیرو، چھل کپٹ سے دور، معصومیت اور معقولیت کا جیتا جاگتا پتلا، جو اپنی فطری شرافت کی بدولت ہر محفل میں بے محل بھی ہے۔ اور ہر ماحول میں محبوب بھی۔ نازوں کی پلی اگلایا اسے دل سے چاہتی ہے مگر یوں سیدھے سبھاؤ ظاہر نہیں ہونے دیتی، کچھ کے البتہ لگاوٹ کا پتہ دے جاتے ہیں۔
دستوئیفسکی اپنے اس ہیرو کو (جو بالآخر زندگی کی چالبازیوں سے ہار گیا) ہیروئن کے ساتھ دکھاتا ہے۔

"مجھے آپ بالکل پسند نہیں" وہ ایک دم بولی، جیسے یہ جملہ منہ پر رکھا تھا، نکل گیا۔

میشکن نے کچھ جواب نہ دیا؛ دونوں طرف منٹ بھر خاموشی رہی۔

"مجھے تو مسٹر گوریل پسند ہیں" وہ تیزی سے کہہ گئی، مگر بہت ہی نیچی آواز میں اور کہتے وقت اپنا سر اور جھکا لیا۔

"مگر یہ تو درست نہیں ہے" میشکن نے سرگوشی کے سے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا تو میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ یہ بالکل درست ہے۔ پرسوں ہی میں نے ان کو زبان دے دی، ٹھیک اِسی جگہ، یہیں۔"

میشکن گھبرا گیا اور دم بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔

"نہیں یہ بالکل درست نہیں۔ آپ نے یہ بات من سے جوڑی ہے۔" اس نے دوٹوک لہجے میں پھر وہی کہا۔

"آپ نے میرا لحاظ کرنے میں تو کمال کر دیا۔ میں آپ کو بتا دوں کہ مسٹر گوریل پہلے سے اب بہت سدھر گئے ہیں۔ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ انھوں نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنا ہاتھ جلا لیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔

"اپنا ہاتھ جلا ڈالا؟"

"جی ہاں، اپنا ہاتھ۔ نہیں مانتے، نہ مانیے، مجھے کیا!"

میشکن پھر خاموش ہو گیا۔ اگلایا کے لفظوں میں کہیں چھیڑ چھاڑ کا شائبہ نہ تھا۔ وہ غصے

میں تھی۔
"کیسے؟ اگر یہاں انھوں نے ہاتھ جلایا تو کیا شمع ساتھ لائے تھے؟ — ورنہ کیسے جلا کر دکھاتے بد"
"جی ہاں — لائے تھے اس میں نہ ماننے کی کون سی بات ہے؟"
"یعنی پورا ہاتھ جلا لیا پوری ایک شمع میں؟"
"ہاں — ہاں! جی نہیں۔ آدھی شمع تھی، شمع کی دُم تھی ..... پوری شمع تھی — اس سے کیا فرق پڑتا ہے! رہنے دیجیے بس! اور کچھ پوچھنا ہو تو سنیے وہ دیا سلائی بھی ساتھ لائے تھے۔ شمع روشن کی اور اپنی انگلی کی لو کے آگے کر دی آدھے گھنٹے تک انگلی جلا کی۔ اس میں بھلا ناممکن والی بات کون سی ہے؟
"کل ہی ملے تھے۔ اُن کی انگلیاں تو صحیح سالم ہیں۔"
اگلایا نے بے اختیار قہقہہ مارا اور بچے کی طرح دیر تک ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی رہی۔
اس ہلکے پھلکے منظر میں ہم دونوں کرداروں کی افتادِ طبع سے واقف ہو جاتے ہیں، جبکہ منظر کشی میں مصنّف نے زبان و بیان کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

در اصل طرزِ بیان کی کنجی نہ قدرتِ کلام کے ہاتھ ہے، نہ کسی اہتمام کے سپرد۔ اس کا راز پوشیدہ ہے مصنّف کی شخصیت، اس کے ذوق اور اس کے تخلیقی برتاؤ میں۔ شخصیت جتنی بھرپور اور رنگا رنگ ہو، ذوق جتنا شُستہ اور شائستہ ہو، زیرِ قلم موضوع پر جتنی دسترس ہو اور جس قدر فن کارانہ خلوص ہو (جسے فکر اور جذبے کی مکمّل ہم آہنگی بھی کہتے ہیں) اور بالآخر زبان کے مزاج سے، اس کے رگ و ریشہ سے آگاہی —— یہ اجزا جتنے بہم ہوتے ہیں، طرزِ بیان اتنا ہی مُنفرِد نکلتا ہے۔ دستوئیفسکی کے یہاں یہ تمام اوصاف اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ تب ہی وہ اپنی اُکھڑی اُکھڑی زبان میں سیاہ کاغذوں کو اَمِٹ روشنی دے گیا۔

عشق — نامُراد اور بامُراد

"......عشق کا لطف و انبساط بے پناہ لیکن اُس میں غم بھی اتنے ہولناک درپیش ہیں کہ عشق کی آگ سے ہمیشہ دامن بچائے رہنا ہی اچھا......" (۲۳ مارچ ۱۸۵۶ء)

یہ جملہ دستوئیفسکی نے ایک خط میں اپنے ہمراز اور دمساز بیرن ورینگیل کو ایسے عالم میں لکھا ہے جب وہ عشق کی آگ میں پہلی بار دامن جلا چکا تھا اور شعلہ گریبان تک پہنچ رہا تھا۔ "پہلی بار" اس لئے کہ ۳۵ برس کی عمر تک یہ معاملات، اُس کی زندگی میں دخیل نہ ہوئے تھے۔

ایک نئے تنقید نگار دچوکونسکی سے کسی خاتون نے سوال کیا کہ دس سال جلاوطن رہنے سے پہلے دستوئیفسکی نے کیسی زندگی بسر کی تھی؟ جواب ملا:

"......میں تو سمجھتا ہوں کہ نکراسوف اور دستوئیفسکی ایک ہفتہ بھی عورت کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے......"

اُس کی ایک محبوبہ، ایک بیوی اور ایک بیٹی کی ڈائریاں بھی الگ الگ شائع ہو چکی ہیں۔ زیادہ کرید کے بغیر، دستوئیفسکی کی اگلی پچھلی "عاشقانہ زندگی" کا ایک ایک تار مل جاتا ہے۔ لیکن سوائے دو ایک خطوں کے، جو اس نے جلاوطنی سے پہلے اور گمنامی و بے چارگی کی حالت سے نکل کر اپنے حقیقی بھائی میخائیل کو لکھے ہیں، کہیں ریشمی آنچل کا سایہ نہیں نظر آتا۔ پہلے ناولٹ "بچارے لوگ" اور چند کہانیوں کی اشاعت کے بعد (۱۸۴۵ - ۱۸۴۶ء) اوپر کے ادب نواز حلقوں میں اور بڑے گھرانے کی نشست گاہوں میں اس نوجوان، ہونہار مصنف کی آمد و رفت، بلکہ آؤ بھگت بھی ہونے لگی تھی۔ تبھی کے یہ خط ہیں۔ ایک میں تو وہ جتاتا ہے کہ "مینا" "کلارا" "ماریانے" کے دیدار کو جاتا ہوں۔ مگر اس میں ڈھیر رقم لگتی ہے۔" دوسرے خط میں جو ۱۸۴۵ء کا لکھا ہوا ہے:

"......کل پہلی بار میں پناتیف کے ہاں گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بیوی سے محبت میں مبتلا ہو کر آیا۔ اتنی ذہین، خوبصورت اور دلربا عورت ہے اور اوپر سے یہ کہ نہایت بے تکلف......"

چھ مہینے بعد اسی بھائی کو لکھا ہے کہ مادام پناتیوا سے محبت کا بخار اُتر تا معلوم ہوتا ہے۔ خود اِسی خاتون نے، جو اپنے نامور اہل قلم شوہر کے ساتھ "کامیاب ازدواجی زندگی" بسر کرتے وقت پندرہ سال تک

اسی کے ایک دوست نکراسوف شاعر کا پہلو بھی گرم کرتی رہی، یادوں (بلکہ یادداشتوں) کا ایک پورا مجلد چھوڑا ہے جس میں "بچارے" دستوئیفسکی کا ذکر یوں آتا ہے گویا اس کے حال پر ترس کھایا گیا ہو۔ "ماریا نے" بائی ہوں یا مادام پناثیوا، دونوں سے واسطہ لطف کی نگاہ تک تھا، یا محض نوجوانی کی ترنگ۔ اس قیاس کی کوئی اور وجہ نہ ہو تو وہ کہانیاں گواہ ہیں جن میں لڑکی یا عورت کا ذکر آیا ہے۔ عورت بس ان میں دُور دُور رہتی ہے۔ اس کا سایہ چلتا پھرتا ہے مثلاً بچارے لوگ ناول اور فوراً بعد کی درجن بھر کہانیوں میں۔

قید و بند کے اندھے غار میں اُترنے سے پہلے عورتیں سفر کے آخری مرحلے پر سائبریا میں اس سے ملنے اور ڈھارس بندھانے آئی تھیں وہ ان دسمبری سرفروشوں کی بیویاں تھیں جو ۲۴ سال انھی غاروں میں عمریں گزار چکے تھے۔ اور ان باوفا عورتوں نے اپنے شوہروں کی خاطر، وطن کے محل دو محلے چھوڑ کر، یہیں مرنا جینا اختیار کر لیا تھا۔ ان نیک بی بیوں نے دستوئیفسکی اور اس کے دونوں ساتھیوں کو انجیل مقدس کا زادِ راہ دیا اور اس میں کچھ روبل کے نوٹ بھی دبا دیے تھے جو بعد میں کام آئے۔ عورت یعنی بیوی یا پیکرِ ایثار کا تصور مرتے دم تک دستوئیفسکی کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ ۳۱ سال بعد بسترِ مرگ پر وہی انجیل اُس کی نظر کے سامنے تھی۔

عورت یا تو ایسی وفا پیشہ بیوی تھی، ماں اور بہن تھی —— یا پھر پیشہ وَر بدقوارہ، جو سائبریائی قید خانوں کی دیوار سے لگی لگی خوانچہ فروشی کرتی پھرتی تھیں۔ دستوئیفسکی کا بیان ہے کہ وہ ایسی عورتوں کی صورت سے متنفر تھا۔ اور بعض قیدی کوڑے کھا کر بھی ان عورتوں کے فراق میں پڑے رہتے تھے۔

"خود میں نے کئی بار اختلاط کے منظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں" اتنا کہہ کر وہ پھر اس ذکر سے گریز کر جاتا ہے۔

اسی قید خانے میں داغستان (شمالی قفقاز) کے تین تاتاری جوان بھی تھے۔ تینوں سگے بھائی۔ سب سے چھوٹا علی ۲۱، ۲۲ سال کا خوش باش، نیک دل، بھولا بھالا لڑکا، بات بات پر مسکرانے والا۔ اس کی مسکراہٹ "اُداسی کے گھُپ اندھیرے میں اُجالا سا کر دیتی تھی۔"

مسلمانوں کا کوئی تیوہار تھا اور علی منہ ڈھانپے پڑا تھا۔ دستوئیفسکی نے —— جو اس سے برادرانہ محبت کرنے لگا تھا اور انجیل کے ورق کھول کر انھی پر بعد میں روسی زبان پڑھانے لگا —— پوچھا۔

"آج کے دن تمھیں اپنا وطن یاد آ رہا ہوگا، اور جب اُس نے 'ہاں' میں جواب دیا تو"

سوال تھا: "سنو علی، تمہارے کوئی بہن بھی ہے ؟"

"ہاں ـــــ ہے تو"

"اگر تمہاری ہم شکل ہوئی تو بے حد خوبصورت ہوگی ـــــ ہے نا ؟

"..... پورے داغستان میں اُس کے حُسن کا جواب نہیں .... مگر ماں مجھی کو زیادہ چاہتی ہے۔"

اپنے ہمسایہ قیدی کی اُداسی دیکھ کر دستوئیفسکی کا خیال فوراً اُس کی بہن کی طرف بہن کی محبت اور ماں کی مامتا کی جانب گیا ـــــ اور وہ علی کے غم میں شریک ہوگیا۔

حالاں کہ یہ ایسی جان لیوا جیل تھی جہاں ـــــ (اور یوں بھی عام جیلوں میں) لمبی راتیں بتانے کی خاطر عورتوں کے تعلق سے فحش باتیں روز مرّہ کا معمول بن جاتی ہیں۔

دستوئیفسکی پورے چار سال بعد، ۱۵ فروری ۱۸۵۴ء کو جیل کے لوہار خانے میں لایا جاتا ہے جب اس کی بھاری بیڑیاں لوہے کی گھَن پر کاٹی گئیں، ہاتھ پاؤں آزاد ہوئے تو اس نے خاک پر سے ان زنجیروں کو اُٹھایا، آنکھوں کے قریب لایا اور پھر وہیں رکھ دیا۔ پاؤں اُٹھے، لڑکھڑائے۔ اور پھر وہ لوہار خانے سے نکل آیا ـــــ آزادی کی جانب نہیں ـــــ اسی سائبیریا میں دُور کے ایک قصبے کی پلٹن میں عام سپاہی کی حیثیت سے جلاوطنی کے باقی ساڑھے پانچ سال کاٹنے کے لئے۔

منگولیا کی سرحد سے ذرا فاصلے پر پانچ ہزار کی آبادی کا چھوٹا سا قصبہ سیمی پلاتینسک جنگ جو مسلمان کسانوں کی بستی سے وے کرتا تاری دوکاندار، کرغیز گڈریے، سرکاری روسی اہلکار، سائبریا کی چھوٹی سی ساتویں پلٹن جو غیر روسی مسلمانوں کی آئے دن کی شورشوں کی روک تھام کے لئے یہاں پڑی ہوئی تھی۔ سات مسجدیں، ایک گرجا گھر، چند دوکانیں، ایک سرائے اور لکڑی کے کچھ گھروندے جو اہلکاروں اور فوجیوں کو کرائے پر مل جاتے تھے۔ دستوئیفسکی کو تھوڑے دن بعد پانچ روبل مہینے پر ایسا ہی ایک مکان مل گیا۔ پانچ روبل میں کھانا اور کپڑوں کی دھلائی شامل تھی۔

مکان مالکہ کو اپنی دو جوان بیٹیوں سے بھی اوپر کی آمدنی ہو جاتی تھی، لیکن دستوئیفسکی ادھر سے بے خبر، اپنی ایک بینچ اور ٹوٹی میز کی کوٹھری میں موم بتی جلائے سائبریائی قید خانے کے اوّلین تاثرات لکھ رہا تھا۔ یہیں نیم تاریک کوٹھری میں (The House of dead) کی وہ ہولناک یادداشتیں

کاغذ پر اُتریں۔ جو عالمی ادب میں اَمر ہو چکی ہیں۔ لکھتے لکھتے قلم اٹکتا ہے، دل اُچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے عزیز دوست امیکوف کو خط میں مخاطب کرتا ہے :

..... کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتا ..... ایک ایسا معاملہ درپیش ہے جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ کام نہیں ہوتا ..... "

یہ معاملہ ہے زندگی میں پہلی بار عاشقانہ پیچ پڑنے کا ــــ وہ بھی ایک دھان پان، شادی شدہ عورت سے۔

عیسائیف نام کے ایک تعلیم یافتہ شخص سے یہیں قصبے کے ایک دیوان خانے میں ملاقات ہوئی اور انہونی بات کہ فوجی اُور کوٹ میں ملبوس ۳۳ برس کے اس کم آمیز "بے لطف" نووارد کو عیسائیف نے اپنے گھر دعوت دے دی۔ صاحب خانہ کی سوجھ بوجھ، سماجی حیثیت اور ملازمت کو کثرتِ شراب نوشی نے کھوکھلا کر رکھا تھا اور دستوئیفسکی جیسے روکھے آدمی کا روز اُس کے گھر آنا جانا چھوٹے سے قصبے میں راز نہیں رہ سکتا تھا۔ بات پھیلی اور دستوئیفسکی کے خط جو سنسر ہوئے اُن سے بھی اصلیت کا سراغ ملا۔

بعد کے ایک خط میں اُسی خاتون کو لکھتا ہے :

"کسی ایک عورت کا میری طرف ہاتھ بڑھا دینا بھی گویا میری زندگی کا موڑ ہے ..... ہم میں بہتر سے بہتر مرد بھی بعض اوقات ــــ اگر سچ پوچھو تو ــــ ٹھٹھ ثابت ہوتے ہیں۔ عورت کے دل، اُس کی ہمدردی، نزاکت احساس ــــ اور پھر اس کی بے پناہ دلداری ــــ جس کا ہم مردوں کو نہ شعور رہوتا ہے نہ اس کی قدر، بلکہ دل میں اس سے کھسیائے رہتے ہیں ــــ ان سب نسوانی صفات کے جواب میں ہم مردوں کے پاس ہے کیا! کچھ نہیں ۔ میں نے یہ سب صفات آپ میں پائی ہیں ......

عمر میں عیسائیف کی بیوی ماریا دمیتریئونا دستوئیفسکی سے صرف پانچ سال چھوٹی، گھر گرہستی میں باکمال، دلنوازی میں ہوشیار بلکہ آزمودہ کار ــــ بظاہر اپنے ناکارہ شوہر سے آسودہ، بباطن ذاتی آسودگی کی جویا۔ اس کا آٹھ سال کا بیٹا تھا ــــ پڑھنے سے جان چراتا تھا۔ عشق کو حیلہ ہاتھ آیا۔ دستوئیفسکی اسے گھر پر پڑھانے کے لئے جانے لگا۔

---

(۱) ژاں ژاک روسو نے بھی کال کوٹھری میں اپنے اعترافات (Confessions) لکھے تھے۔ ت ا

کئی مہینے یوں ہی گزر گئے۔ اُمید و ہراس کے مارے ہوئے مصنف کی آتشِ شوق کم نہ ہوئی —— اور ماریا بھی اس بیمار، بدشکل، اور سزا یافتہ اُمیدوار کو شہ دیتی رہی کہ جی بہلتا رہے —— یہاں تک کہ یار دوستوں نے کہہ سُن کر شوہر کو سات سو کوس، کوزنتیسک کے مقام پر کلرکی دلوادی —— اس نے سامان سفر باندھا اور بیوی بچے لے کر روانہ ہوا —— اتنی پی چکا تھا کہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ گھوڑا گاڑی میں اُس کی جگہ دستوئیفسکی براجمان ہے اور دردِ جدائی سے ہلکان ہے۔

جب وہ بستی سے باہر دور تک ماریا کو رخصت کر کے گھر آیا تو خواب و خور حرام ہو چکا تھا اور درد بھرے خطوط کے سوا لکھنا پڑھنا بند۔

آخر بیرن ورینگیل نے، کہ خود بھی چھ بچوں کی ایک ماں کا غم دیدہ، ستم رسیدہ عاشق تھا، اپنے اس بے بس، بدحواس اور بے خواب دوست کی تسکین کی صورت نکالی۔ آدھے فاصلے پر ایک مقام پر دونوں کی ملاقات کا انتظام کیا۔ ماریا کو جس دن وہاں پہنچنا تھا وہاں اُس کا خط پہنچا کہ شوہر کی بیماری سے مجبور ہوں (پھر ایک خط سے یہ اطلاع تھی کہ ایک طرف تو یہ اجنبی شہر —— دوسرے شوہر مستقل بیمار، زندگی بے لطف —— البتہ شوہر کی عیادت کو آنے والا ایک نوعمر اسکول ماسٹر ہے ویرگونوف جس سے بات کر کے جی خوش ہو جاتا ہے۔

دستوئیفسکی نے تڑپ تڑپ کر کئی خط لکھے —— رقابت، دُوری اور" اُدھر کی مجبوری" گلے شکوے۔ اُس نے اپنی بے لوث محبت کا یقین دلانے کے ساتھ ساتھ، جہاں سے، جیسے بھی سبیل ہوئی، تھوڑی بہت رقم بھی دلائی۔ یہاں تک کہ خبر آئی، مسٹر عیسائیف کا انتقال ہو گیا۔ راستے کا کانٹا تو نکل گیا لیکن ضمیر میں کانٹا بھی چُبھ گیا کہ شاید میں اسی دن کا آرزومند تھا —— میں بھی اس موت کا ذمہ دار ہوں۔

بے سبب نہیں کہ دستوئیفسکی کی بعد کی تصانیف میں خصوصیت کے ساتھ خود کو اپنوں اور غیروں کے قصور یا بدقسمتی کا ذمہ دار ٹھہرانے والے کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا تعلق مسیحی تبلیغ سے اتنا نہیں جتنا خود مصنف کی افتادِ طبع اور شعور سے ہے۔

اصل کانٹا شوہر نہیں بلکہ بیوہ ماریا دمیتریئونا کا نوجوان دوست ویرگونوف تھا —— عمر میں اس سے بھی پانچ سال کم۔ جو یوں تو سیدھا سادہ اسکول ماسٹر تھا —— مگر آگے چل کر نکلا نہایت تیز۔

دستوئیفسکی سو جتن کر کے، اپنے "فرشتۂ رحمت" سے ملنے پہنچا۔ اُسے تشفّی دی۔ سمجھایا کہ اب میرے ستارے گردش سے نکلنے والے ہیں۔ مجھے فوج میں ترقی اور سزا سے معافی ملنے والی ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے بیٹے کو۔ جس کی تعلیم و تربیت کا پورا بار اپنے سر لیتا ہوں —— فوج میں اُمیدوار کرا دوں اور اس (عاشق یا)

دوست کو ترقی مل جائے۔

واقعی، وہ ماریا کی بے رخی یا دو رخی برتاؤ سے ٹوٹا نہیں ـــــ بلکہ اور شدّت کے ساتھ اس کے مستقبل کے سنوارنے میں اُلجھ گیا۔ اب اسے اپنا وہ رقیب سگے بھائی سے زیادہ عزیز نظر آنے لگا جو چند روز پہلے ایک خط میں جلی کٹی سُنا چکا تھا۔ اپنے اسی غم گسار دوست ورنگیل کو، جس نے اس روپے پر بھویں چڑھائی ہوں گی لکھتا ہے:

"..... مجھے خبر ہے کہ میں (ماریا) کے تعلق سے کوئی معقول بات نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ میں اس طرح سوچ رہا ہوں۔ بس اتنی تمنا ہے کہ اس سے مل سکوں، اس کی آواز سن سکوں۔ ایک غم زدہ دیوانہ ہوں میں۔ ایسا عشق خلل دماغ ہے۔ جانتا ہوں ..... میں پھر ملنے جاؤں گا خود کو برباد کروں گا ـــــ مگر اس کی کیا پروا ـــــ

وہ پھر ملنے گیا اور یا تو چند ہفتے پہلے ماریا اور ویرگونوف کی شادی کے لئے "صرف اسی کی خوشی کی خاطر" روپے پیسے کا بندوبست کر رہا تھا، یا اپنی بات پکی کر آیا۔ غالبًا ماریا اس کی "قربانی کے کھرے پن" سے اور مستقبل کی اُمیدوں سے پگھل گئی اور "نہیں کی نہیں سہی" تک بات پہنچی۔

وہاں سے خوش خوش آیا اور چھوٹی بہن کو التجائیہ خط لکھا کہ خالو سے قرض دلوا دو ـــــ اور اس رشتے کو گلے اُتار لو۔

"..... میری کا پیاری بہن ..... قطعی یہی عورت ہے میرے جوڑ کی۔ تعلیم بھی ہم دونوں کی یکساں ہے اور ہم ایک دوسرے کو سمجھتے بھی ہیں خوب ..... رہی عمر، سو میں ۳۵ کا ہوں، وہ ۲۹ کی .....

عزیز، رشتہ دار، کوئی اس رشتے سے خوش نہ تھا؛ تاہم ۲۳ جنوری ۱۸۵۷ء کو خالو نے چھ سو روبل بھیج دیے، کچھ ادھر اُدھر سے انتظام ہو گیا؛ ۶ فروری کو سیکنڈ لفٹننٹ، خاندانی شریف زادہ فیودر میخائیلووچ دستوئیفسکی دولھا بن کر گرجا گھر میں کوڑی کوڑی کو محتاج بیوہ دولھن کا ہاتھ تھامے داخل ہوا اور شادی ہو گئی۔ ڈھائی سال کی اُمید و یاس کے بعد عاشق سے شوہر میں تبدیل ہونے کی خوشی کچھ معمولی نہ تھی۔ رخصتی پر جب وہ اپنی ڈیوٹی کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوا، عین دوران سفر میں برنال کے مقام پر اعصابی دورہ پڑا اور وہ وحشیوں کی طرح ہاتھ پاؤں پٹک کر بے ہوش ہو گیا۔ چار دن تک دولھا اپنی دلھن اور سوتیلے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے مرگی کے خوفناک دورے کی مار میں بے بس پڑا رہا۔ اور دلھن اجنبی شہر میں غیروں کے گھر اپنی یہ رُسوائی سہتی رہی۔

سیمی پلاٹنسک آ کر دستوئیفسکی نے ایک معقول مکان کا انتظام کیا اور بیوی نے سلیقے سے اس گھر کو

معقول لوگوں کی آمدورفت کے قابل بنا دیا۔ ایک ملازم بھی مل گیا جس میں کئی گن تھے: بیک وقت کوچوان باورچی اور خدمتگار۔

خانہ داری سے پہلا سابقہ تھا لیکن دستوئیفسکی نے، بعد کی بڑھتی ہوئی ناگواریوں کے باوجود، اپنے ایثار، دردمندی اور خدمت سے ایسا نباہا کہ ٹھیک ، سال بعد جب ماریا دمیتریئونا کا انتقال ہوا ہے، تو ـــــ حالاں کہ زن و شو دونوں ایک دوسرے کی وفا کی طرف سے کھٹکے ہوئے تھے ـــــ دستوئیفسکی مہینے بھر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا۔

ٹھیک دس سال بعد (۱۸۵۹ء) بڑی سفارشوں اور التجاؤں، قصیدہ اور مرثیہ عرض کر چکنے کے بعد شاہی پابندیاں اُٹھائی گئیں اور وہ کرسس کی انھی تاریخوں میں جن میں پابہ زنجیر نکالا گیا تھا، بیوی اور سوتیلے بیٹے سمیت (جسے بڑے لاڈ سے پال رہا تھا) پائے تخت میں داخل ہوا۔

بیوی کی مسلسل بیماری، طعنے تشنے، بے لطف زندگی کے احساس اور مہلک آزار نے دستوئیفسکی کی بے لوث محبت کو خود آزاری میں بدل ڈالا تھا۔ رات رات بھر لیمپ جلا کر کاغذ سیاہ کرنا اور درمیان میں اُٹھ کر دوا دارو دینا، اور دن میں دوپہر کے بعد اخبار کی ادارت، دنیا داری کے جھمیلے۔ کون جانتا تھا کہ یہ نئی زندگی کی تیاری کی دوسری آزمائش ہے۔

اس ویرانے میں ایک بار پھر کوئی صورت نظر آئی۔ یہ مادام شوبر (Schubert) تھی، ایک شوخ اور خوش اوقات شادی شدہ ایکٹرس، جو اپنے اچھے دنوں کے قابلِ ذکر اہلِ قلم اور فن کاروں سے داد وصول کرنے کی شوقین تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مادام نے فیودر کو اپنی زلف گرہ گیر میں اُلجھا تو لیا، لیکن سلجھایا کبھی نہیں۔ کیوں کہ ۱۲ر جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں مصنف نے اپنی بے داغ، بے تمنا محبت کا یقین دلانے کے ساتھ یہ بھی شکوہ کیا ہے کہ مادام اُسے کسی قابل شمار ہی نہیں کرتی ہے ـــــ اپناپن برتنے سے کتراتی ہے۔

مادام شوبر سے خط و کتابت تو رہی، مراسم نہیں رہے البتہ اس طرح کے تجربے نے آئندہ کے لئے راہ ہموار کر دی کہ وہ اپنے فراخ سینے کے وسعت میں بیک وقت دو محبتیں، دو قسم کے متضاد جذبے پال سکتا ہے ـــــ ویسے ہی جیسے اس کے اہم ناولوں کے اہم کردار۔

اب ہم روشناس ہوتے ہیں اُس بے درد، شوخ، سرکش، تلوّن پسند اور نفرت و الفت کے خمیر سے اُبھرنے والی ایک نوعمر حسینہ سے جس کے بغیر دستوئیفسکی کی زندگی تشنگی میں گزرتی اور اس کی کئی تصنیفوں کا

"ایڈیٹ"، "جواری") کو بھرپور ہیروئن میسر نہ آتی۔ یہ ہے اپولنایا پروکوف ئیونا سُسلوا — جو آگے چل کر سُسلوا کے نام سے مشہور ہوئی۔

پہلی ملاقات کسی پبلک جلسے میں ہو چکی تھی، لیکن دستوئیفسکی کی زندگی میں وہ داخل ہوئی اُس دن جب یونی ورسٹی کی طالب علم پولینا سُسلوا کی پہلی کہانی ستمبر ۱۸۶۱ء کے vremya (وقت) میں شائع ہوئی اور وہ ایڈیٹر فیودر دستوئیفسکی سے ملنے اس کے دفتر آئی۔ وہ بمشکل ۲۱ سال کی تھی اور ایڈیٹر عمر میں اُس سے دوگنا۔ قیاس کہتا ہے کہ شروع کی چند ملاقاتوں میں ہی، بن کہے سُنے، تن مَن کا سودا ہو گیا لیکن بعد میں وہ پچھتائی اور پچھتاوا ایسے انتقامی جذبے میں بدل گیا جو آنکھ مچولی میں عاشق کے خبط سے لطف اندوز ہو سکے۔

حکومت نے ایک مضمون پر ناراض ہو کر "وقت" رسالہ بند کرا دیا اور ایڈیٹر تازہ ہوا لینے کے لئے، جون ۱۸۶۲ء میں یوروپ کے پہلے سفر پر نکل گیا۔ ڈھائی مہینے بعد وہاں سے واپسی پر، ۶۳-۱۸۶۲ء کی سردیوں میں ہر طرف شکستہ خاطر ہو کر اور پولینا سے ہم سفری کا پیمان لے کر اُس نے پھر پاسپورٹ حاصل کیا۔ وہ ابھی سفر کی تیاریوں میں تھا کہ پولینا آزادانہ فیصلے یا بے نیازی کا مظاہرہ کرتی ہوئی مقررہ تاریخ پر پیٹرسبورگ سے پیرس روانہ ہو گئی۔

اگست کے وسط میں وطن سے نکلا اور راستے میں عالمی شہرت کے جواخانے (رولٹ)، پر قسمت آزمائی کے لئے اٹک گیا۔ یہاں تو خیر، بار جیت کر پانچ ہزار روبل بچے، پیرس میں قسمت نے نیا گُل کھلایا۔ پولینا اپنے جیسے ایک فتنہ پرور ہسپانوی جوان پر فدا ہو گئی اور دستوئیفسکی کو لکھ بھیجا کہ دیر کر چکے ہو، اب نہ آنا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے کارنامے اور دستوئیفسکی کے تمام معاملات ذرہ ذرہ اس ہنگامہ خیز ڈائری میں لکھ دیے ہیں جو مصنف کی وفات کے چند سال بعد شائع ہوئی اور جس نے اہلِ قلم عورتوں کی حیا کو چیلنج کر دیا۔ وہیں سے یہ مکالمہ سننے کے قابل ہے۔

[۲۶ اگست کو پیرس پہنچتے ہی دوسرے دن دستوئیفسکی اُس کی قیام گاہ پر ملنے پہنچا اور دیکھتے ہی دونوں بازو پھیلا دیے]

"ارے۔ میں سمجھی تھی، آپ آئیں گے ہی نہیں — خط جو لکھ چکی ہوں"

"کیسا خط؟"

"خط کہ پیرس نہ آنا"

"کیوں نہ آنا ؟"

"کیوں کہ اب وقت نکل چکا"

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

"سنو پولینا، کہیں چل کر بیٹھیں، مجھے سب کچھ بتاؤ، نہیں تو جان دے دوں گا" ہم اسی کی قیام گاہ کی طرف چلے۔

راستے بھر فیوڈور نہایت نروس رہا۔ اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے قدموں میں گر پڑا اور میرے زانو تھام کر سسکیاں لیتے ہوئے بولا :

"تم میرے ہاتھ سے گئیں —— میں پہلے ہی جانتا تھا"

پھر جب ذرا قرار آیا تو ضد کر کے پوچھنے لگا "کون ہے وہ ؟" اور جب میں نے بتایا کہ اسپین کا ہے، ایسا ایسا ہے، تو پوچھا :

"تو کیا تم نے خود کو، بالکل ہی اس کے حوالے کر دیا ؟"

"مت پوچھیے، نازیبا حرکت ہے !"

"اچھا، خوش ہو نا ؟"

"نہیں"

"محبت کرتی ہو اور خوش نہیں، یہ کیسے ؟"

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا"

"کیا مطلب ؟ —— " فیوڈور چیخ پڑا " وہ نہیں چاہتا تمھیں۔ تو کیا تم غلامانہ اس پر مرتی ہو ؟ جد ھر وہ جائے گا خدا کے کچھواڑے، تم بھی پیچھے پیچھے چلی جاؤ گی ؟"

"نہیں —— میں دور کسی گاؤں میں مر رہوں گی "

"چلو —— چھوڑو، اطالیہ چلتے ہیں، میں بھائی کی طرح تمھارا رفیقِ سفر رہوں گا۔"

دستوئیفسکی کی باتوں نے، اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر صورت حال کو قبول کر لینے کی سکت نے پولینا کے زخم پر مرہم رکھا: "مجھے آرام سا ملا۔ یہ شخص سمجھتا ہے میرے دل کا حال۔"

دو ایک دن بعد اسی اسپینی ساجن کے کسی دوست کا خط آیا پولینا کے نام کہ آپ کے دوست کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے اور ملنا جلنا منع ہے اس لئے ادھر آنے کی زحمت نہ کیجیے! دستوئیفسکی اسے پریشان دیکھ کر دلاسا دینے لگا کہ کوئی بات نہیں، علاج سے ٹھیک ہو جائے گا۔

دوسرے ہی دن "ٹائیفائڈ کا یہ ناتواں مریض" ہنستا کھیلتا پیرس کی ایک شاہراہ پر نظر آیا تو پولینا آگ بگولہ ہوگئی۔ سامان پیک کیا اور دستوئیفسکی کے ساتھ "برادرانہ سفر" پر چل دی۔

سفر میں وہ بڑی خرچیلی ساتھی نکلی۔ ادھر مصنف پر اپنی عاشقانہ نامرادی میں جوئے کا جنون پھر سوار ہوا اور وہ ساری نقد رقم ہار گیا۔ یہاں تک کہ پولینا کی انگوٹھی تک رہن رکھ دی۔

بیڈن بیڈن کے مقام پر پہنچ کر (جو گرم پانی کے چشموں اور جوا خانوں کی وجہ سے تفریحی مرکز بنا ہوا تھا) وہ ایک ایسا واقعہ درج کرتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ پولینا کے حسن و ادا نے پھر ایک بار اسے بے بس کر دیا تھا اور نیت بدل گئی تھی ـــــ لیکن وہ اس کی بے بسی سے کھیلتی رہی ـــ یہاں تک کہ شدتِ اضطراب میں وہ جوا خانے کے چکر کاٹتا اور آخری پیسہ تک ہارتا چلا گیا۔

اکتوبر کے آخر میں وہ واپس پیرس چلی گئی اور دستوئیفسکی ہومبرگ میں اٹک گیا۔ قرض رقم کے انتظار میں۔ پولینا نے جیسے تیسے جوڑ کر کچھ رقم پیرس سے بھیجی تو وہ روس واپس آسکا پھر دو سال تک، خط و کتابت تو بہت کٹیلی رہی۔ ملاقات نہ ہوسکی۔

دسمبر ۱۸۶۴ء میں اپنی ڈائری میں اندراج کرتی ہے۔

"..... جب تصور کرتی ہوں کہ دو سال پہلے مجھے کیا ہوگیا تھا تو دستوئیفسکی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔
یہی شخص ہے جس نے میرے ایمان و عقیدے کا پہلے پہل قتل کیا۔ ....."

حیرت ہے کہ دستوئیفسکی کو حالاں کہ اس ڈائری کی خبر تک نہ تھی مگر ٹھیک یہی جملہ، اسی کردار کی ایک عورت، عین اسی صورتِ حال میں کہتی ہے۔

پولینا سسلووا نے دستوئیفسکی سے تعلقات توڑے نہیں بلکہ دو سال بعد چند روز کی رفاقت یا آخری "جشنِ مرگِ محبت" سے پہلے اپنی بہن کے ذریعے معلوم کرایا کہ اِن دنوں مصنف کا دل کیا کہتا ہے۔ اور مصنف نے اگلے پچھلے تمام شکوے اُگل کر آخر میں لکھا:

"..... میں اب بھی ہاں، لمحے تک اسے جی جان سے چاہتا ہوں۔ مگر تمنا ہے کہ اب اس محبت سے نکل آؤں۔ آئندہ کبھی نہ چاہوں۔ وہ میری محبت کے قابل نہیں۔ دل دُکھتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ ہمیشہ دُکھی رہے گی۔ اسے نہ کبھی جیون ساتھی نصیب ہوگا، نہ راحت۔ وہ جو اوروں سے تو سب کچھ طلب کرے اور خود کو ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش جانے، اسے کبھی سُکھ نہیں مل سکتا ....."

پولینا سسلووا اسے جلا کر اپنا جی ٹھنڈا کرتی تھی اور دستوئیفسکی اس شعلہ جوالہ کے ہاتھوں سلگتے رہنے پر رضامند تھا۔ سلسلہ اور چلتا۔ لیکن جیب خالی اور گھر سے خط آرہے تھے کہ ماریا دمتریئونا جاں بلب ہے۔

دستوئیفسکی نے بیمار بیوی سے اپنے سفر کی یہ نازک وجہ راز میں رکھی تھی لیکن جس راز کا دشمنوں کی محفل میں چرچا ہو، وہ دوستوں سے کیا چھپتا۔

دستوئیفسکی پیٹیرسبورگ پہنچا۔ بات بنائی، بیوی کی تیمارداری میں دن رات ایک کیا۔ آب وہوا کی تبدیلی کے لئے اسے ماسکو لے آیا۔ وہیں وہ انتقال کر گئی۔ بیوی کی موت پر پولینا کو خط تک نہیں لکھا۔ مرنے والی سے محبت کی توہین ہوتی!

.....(ماشا) کا جنازہ رکھا ہے۔ حضرت مسیح کے ارشاد کے مطابق، اپنوں سے ایسی محبت کرنا، جیسے ہم خود سے کرتے ہیں، ممکن نہیں ..... ہماری اپنی ذات اس میں رُکاوٹ بنتی ہے .....''

درینگیل، میرے دوست یقین کرنا کہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ میری چاہت کا بھی ٹھکانا نہیں تھا تاہم ایک دوسرے کے ساتھ ہم خوش نہ رہ سکے —— اگرچہ یہ طے ہے کہ ہمارا نباہ نہ ہوا، مرحومہ کے عجیب و غریب، شکی اور وہم پرست مزاج کے باعث ہمارے درمیان رنجش رہی، پھر بھی ہمارے درمیان محبت میں فرق نہ آیا۔ جس قدر ہم ایک دوسرے سے رُوٹھتے یا ناخوش ہوتے، اتنا ہی یہ بندھن اور پکا ہو جاتا.....

یوں تو سسلووا کی جوانی دیر تک چلی اور سرکش، بے باک شخصیت کی کشش اس درجہ قائم تھی کہ دستوئیفسکی کی موت کے سال (۱۸۸۰ء میں) اسی کے ایک عقیدت مند نوجوان اہلِ قلم روزانوف نے شادی کی اور چھ سال تک تقریباً زن مرید کی طرح ساتھ رہا۔ لیکن دستوئیفسکی نے اپنی بیوی کے انتقال کے سال بھر بعد (۱۸۶۵ء) جب وہ رُوس واپس آئی ہوئی تھی، پھر آخری کوشش کی۔ یہاں تک کہ شادی کی پیش کش کر دی —— یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر بالفرض پیش کش منظور ہو گئی تو ٹریجیڈی پر تمام ہو گی ....." تین دن میں شوہر سے نفرت کرنے لگو گی اور اسے چھوڑ جاؤ گی "

پولینا نے اپنی ڈائری میں اس پیشکش پر اپنی ناگواری کا ریمارک دیا ہے ؎

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

آخر جب نفسیاتی پیچیدگیوں کے ناول نگار نے آخری رفیقِ حیات چنی تو پولینا کو بہت سنبھال کر اطلاع دی:

".....میری پیاری، میں تمہیں اس ادنا درجے کی اور لازمی سی مسرت کی دعوت کیا دوں ......"

اور خط تمام ہوتا ہے یوں: خوش رہو میری عمر بھر کی دوست

واقعی دستوئیفسکی اِس کی محبت سے کبھی دست بردار نہ ہوا۔ کنوارپن کے پہلے تجربے میں یقیناً دونوں برابر کے شریک تھے۔

ماریا، تمیر ٹیونا کے انتقال اور پولینا سے عشق کے زوال کے بعد دستوئیفسکی نے دو سال بے پناہ تصنیفی سرگرمی میں بسر کیے۔ قمار بازی اور عشق بازی دونوں کی حدت اور شدت تھی تو سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ دو سہ ماہی رسالہ "Epokha" (دَور) شائع کرنے کی اجازت ملی "مُردہ گھر کی یادداشتیں" "ذلتوں کے مارے لوگ"، "زیرِ زمین زندگی کے نوٹ" "گرمیوں کے تاثرات پر سردیوں کے اندراج" "جواری" یہاں تک کہ عظیم ناول "جرم و سزا" سب انھی برسوں میں تیاری یا اشاعت کو پہنچے۔ چالیس برس سے گزر کر، مرگی اور جوئے کے دورے، کثرتِ کار، افکار اور راتوں کی جگائی نے اسے بظاہر خستہ حال کر دیا تھا مگر پھر بھی پوشکن کی طرح اُمید کا دامن تھامے رہا:

کیا خبر جب ہو مری عمر کی ڈھلتی ہوئی شام
عشق دے جائے تبسم کا کوئی آخری جام

"...... مجھ میں بلّی کی سی طاقت ہے ذنوز زندگیاں جینے کی، ان حالات میں بھی حیاتِ نو کی پھر تیاری کر رہا ہوں......"
واقعی وہ دائیں بائیں اس "تیاری" سے غافل نہیں تھا۔

رسالے "ایوخا" میں باہر کی ڈاک سے دو کہانیاں چھپنے آئیں۔ کچے مگر ہونہار قلم کی پہلی کوشش۔ خط و کتابت چلی۔ آخر اس اشراف خاندان میں، جہاں لڑکیوں کو غیروں سے خط و کتابت یا ربط ضبط کی اجازت نہ تھی، طے پایا کہ لڑکی ماں اور بہن کے ساتھ پیٹرسبورگ جائے اور ایڈیٹر کو گھر بلا کر سب کی موجودگی میں ملے۔ یہ لڑکی آننا دسیلی ئیونا کروکوفسکایا تھی۔ عمر بمشکل ۱۹ سال۔ وہ خود ملنے آئی۔ دستوئیفسکی نے میز سے نظر اٹھائی اور سرو قد، زلف بدوش، بیقرار، سبز آنکھوں والی غیر معمولی اٹھان کو دیکھتے ہی بجلی گری۔ پھر وہ اس "مہمان" خاندان کے ہاں روز روز وارد ہونے لگا۔ آننا سے کبھی کسی علمی موضوع پر بحث و تکرار بھی ہونے لگی، وہ اُسے چڑانے کو اس کے خیالات کی تردید بھی کرنے لگی ——— یہ بات آزار طلبِ مصنف کے لیے امید افزا تھی۔ اور وہ بعض اوقات ایسی بے تکلفی دکھانے لگا کہ آننا اور اس کی ماں نے محسوس کیا کہ بہ نفسِ نفیس ناول نگار کو برتنے کے بجائے اس کے ناول پڑھ لینا زیادہ پُر لطف رہے گا۔

آننا کی ایک چھوٹی بہن تھی سونیا ـــــ ۱۴ سال کی نادان بچی ـــــ لیکن وہ اندر ہی اندر اس "بے تکے" مگر جدت پسند مصنف کی آنچ میں سلگتی رہی۔ دستوئیفسکی بڑی بہن کے بھرے بھرے سڈول شانوں سے پار اس شریر بچی کی نگاہوں کا افسانہ نہ پڑھ سکا۔

دلِ ناداں نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی
نگاہِ یار کہتی تھی کوئی افسانہ برسوں سے

دستوئیفسکی دبی زبان سے آنکھیں جھکا کر آننا کو سمجھایا کرتا:

"...... سنئے خدارا میری بات سمجھئے! جب سے دیکھا ہے تبھی سے آپ کو چاہنے لگا ہوں۔ یہ محض دوستی کی بات نہیں بلکہ ایسا شدید جذبہ ہے جو میرے پورے وجود میں سما گیا ہے۔"

لیکن سائنس اور سیاست کو ابھی ان دونوں بہنوں سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ جنرل کروکوفسکایا کی دلیر بیٹی نے صاف کہہ دیا کہ وہ "اپنے پورے وجود کو خانہ داری کے سپرد نہیں کر سکے گی"۔ اقرار و انکار کی یہ دھوپ چھاؤں فریقین کو آگے چل کر راس آئی۔ دستوئیفسکی اگرچہ ہارے ہوئے جواری کی طرح دم سادھ کر رہ گیا۔ تاہم آننا کی قدِ آدم تصویر اُس نے کئی ناولوں اور کہانیوں میں اہتمام بلکہ احترام کے ساتھ سجائی ہے۔

۱۸۶۴ء کے آخری دنوں میں ایک اور عجیب و غریب نسوانی وجود منظر پر اُبھرتا ہے ـــــ یہ ہے مارفا براؤن، جہاں گشت، تعلیم یافتہ، زمانے کا سرد و گرم چکھے، بلکہ پچائے ہوئے، یورپ کے عالی شان ہوٹلوں سے لے کر فٹ پاتھ تک جا بجا شب و روز گزارے ہوئے۔ "اپوخا" رسالے کے دفتر میں ایک وقتی جرنلسٹ تھا، انگریزی کا مترجم گورسکی ـــــ وہ پیٹرسبورگ آکر اس کے ہاتھ پڑی اور بیاری کس مپرسی میں مبتلا ہسپتال پہنچائی گئی۔ دستوئیفسکی شروع میں ہمدردی جتانے اور مدد کرنے ہسپتال گیا اور پھر اس کا مبتلا ہو گیا۔ خیر خواہی نے اس عورت میں جو دنیا بھر کے مردوں سے بے زار ہو چکی تھی، عزتِ نفس کا جذبہ جگایا۔ اسی کے ضمن میں کوئی اور جذبہ بھی، جس کے جواب میں، مارفا نے بہت رکھ رکھاؤ اور احسان مندی کا خط لکھا ہے جو یوں ختم ہوتا ہے:

"...... میرے نزدیک اب اس بات کی کوئی وقعت نہیں کہ آپ کے دل میں جو میری جگہ ہے وہ زیادہ دیر تک بنی رہتی ہے یا تھوڑے عرصے باقی رہے گی۔ مگر تسمیہ کہتی ہوں کہ کسی بھی دنیاوی غرض یا فائدے سے بدرجہا بلند ہے میرے نزدیک یہ حقیقت کہ آپ نے میری فطرت کے گرے ہوئے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا اور خود میری نظر میں جو حیثیت رہ گئی تھی اس سے اونچا اٹھا دیا ......

تقریباً یہی وہ الفاظ ہیں جو ناول Idiot کی نستاسیا، غیر ہاتھوں سے گزری ہوئی نستاسیا اپنے پاک باز چاہنے والے میشکن سے کہتی ہے۔

یہ جنوری ۱۹۶۵ء کا خط ہے اور غالباً آخری ہے جو ناول نگار کی خیر خواہانہ عاشقی کے دامن پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ بیوی کی موت کے بعد، جن دنوں وہ بے داغ اور بے مثال آنا کرو کوفسکایا سے لو لگائے ہوئے تھا، تبھی کچھ دنوں، مارفا کے ساتھ رہا بھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سے گھر بسا لیتا لیکن مارفا قانونی کاغذات کی رُو سے شادی شدہ عورت تھی اور اس سے دست برداری کا حق دار برسوں پہلے لاپتہ ہو چکا تھا۔

جوان بھائی میخائیل کی ناوقت موت نے "اپوخا"، رسالے اور کتابوں کی اشاعت کے کاروبار کو سخت دھکا پہنچایا تھا اور دستوئیفسکی قرضوں، بدنامیوں، نکتہ چینیوں سے تنگ آکر ملک چھوڑنے کی فکر میں تھا۔ بدقّت تمام ایک چالاک پبلشر سے اس شرط پر پیشگی تین ہزار روبل کی رقم مل گئی کہ مصنف پہلی نومبر (۱۸۶۶ء) تک نیا ناول اور پچھلی تحریروں کے کتابی اڈیشن کا حقِ تصنیف اس کے حوالے کر دے۔ دستوئیفسکی قرض داروں اور حاجت مند عزیزوں کی جھولی میں حصّہ رسدی ڈال کر باقی، کوئی ڈیڑھ سو روبل نقد لیے ہوئے Wiesbaden پہنچا۔ رولٹ کی میز سے رقم مار لینے کے سوا یہ بھی توقع تھی کہ شاید پولینا سسلووا ملے اور اس بار پگھل جائے۔ سسلووا آئی۔ چند روز ساتھ رہی بھی۔

بالآخر اس بے زار عاشق کو، جو انگوٹھی اور بُندے تک رہن رکھوا کے بازی لگاتا تھا، اپنے حال پر چھوڑ کر نکل گئی۔ دل سے جیتے جی نہیں نکلی۔

اگست ختم ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچی کہ کھانے تک کے پیسے نہ تھے اور وہ بھوک کے مارے ہوٹل کے کمرے سے نہیں نکلتا تھا۔ آخر کرائے کا بندوبست کر کے رُوس واپس آ گیا۔

اکتوبر شروع ہوگیا اور ناول کی لکھت شروع نہ ہوئی ——— مختصر ناول لکھنا تھا "جواری" دوستوں نے طے کیا کہ روس میں اب اسٹینوگرافی کا رواج ہونے والا ہے، کیوں نہ اسی ناول کی تحریر پر آزمایا جائے۔ اشتہار دیا گیا۔ بالآخر ۴ اکتوبر ۶۶ء کی صبح کمسن عمر کی ایک سنجیدہ اور مہذب لڑکی نے مفلس مگر نامور ناولسٹ کے فلیٹ پر دستک دی۔

۴۵ برس کے تھکے ہارے مصنف نے دیکھا کہ اب خود لکھنا نہیں، بول بول کر اس لڑکی کو لکھوانا ہے تو اس خیال سے ہی پریشان ہوگئے۔ دو ایک دن کمرے کی چہل قدمی اور تمہید میں گزر گئے۔

"تو بیا کہ در بر من تہی از من است جایت"

۳۰ اکتوبر کو، مصنف کی سالگرہ کے دن، ۴۰ ہزار الفاظ کا یہ ناول ٹائپ کاپی بن کر مکمل ہوگیا —— اور مصنف اس کم عمر اسٹینوگرافر کے حوصلے، محنت، ضبط و احتیاط اور سلیقے کا قائل ہوگیا۔ یہ لڑکی تھی آننا گری گوریئونا سنیت کن ——— ایک تمیز دار مگر کم حیثیت گھرانے کی بیٹی، جس نے بعد میں اپنے اور دستوئیفسکی کے ابتدائی معاملات رتی رتی لکھ دیے ہیں۔ آگے کی روداد اسی کی زبانی سننے کے قابل ہے:

[تیسرے دن جب وہ ہمارے گھر آیا اور ماں سے کہا کہ ابھی زیر تحریر "جرم و سزا" ناول کے آخری باب باقی ہیں، وہ بھی اسی طرح ہو جائیں۔ ماں کی اپنی رضامندی سے ۸ نومبر کو جب میں پہنچی تو وہ کسی مخمصے میں پڑا ہوا تھا]

"سنو، مجھے ایک نیا ناول سوجھا ہے، مگر اس کا انجام سمجھ میں نہیں آتا۔ مسئلہ ہے ایک کم عمر لڑکی کی نفسیات کا۔ اگر میں ماسکو میں ہوتا تو اپنی بھتیجی سونیا سے مشورہ کر لیتا۔ مگر اب تم ہی سوچ کر بتاؤ"

...... کہانی کچھ اس طرح کی تھی کہ پکی عمر کا ایک مصور ہے۔ سمجھو کہ میرا ہم عمر۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ بہن۔ ہر طرف سے بے زار ہو کر وہ اپنی راحت کی جستجو کرتا ہے۔ اس فیصلہ کن مرحلے پر ایک ذہین اور حساس لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے تو کیا وہ اسے سچی محبت دے سکتی ہے؟۔

"فرض کرو، وہ لڑکی تم ہو اور وہ مصور میں ہوں۔ تم پر اپنی محبت جتاتا ہوں اور بیوی بننے کو کہتا ہوں تو صاف بتاؤ —— تمہارا جواب کیا ہوگا"

[آننا کہہ کر وہ اپنے سوال پر دم بخود رہ گیا مگر لڑکی نے سادگی سے جواب دیا]

"میرا جواب یہ ہوگا کہ مجھے آپ پسند ہیں اور زندگی بھر محبت کرتی رہوں گی"

ہفتہ بھر بعد دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ہر شخص حیرت زدہ تھا کہ ۴۵ برس کا نامور مگر بیمار، قرضدار مصنّف — اور ۱۹، ۲۰ برس کی نادان اسٹینوگرافر — اس "ناول" کا انت کہاں ہوگا!

۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو شادی ہوئی۔ اور انت یوں ہوا کہ آنّا سینت کن نے رفتہ رفتہ دستوئیفسکی کا دل مٹھی میں لے لیا۔ چوّدہ برس ساتھ رہا۔ اور جب دستوئیفسکی نے دنیا کو خیرباد کہا تو اپنی زندگی کے صرف انہی چوّدہ برسوں کا شکرگزار تھا جنھوں نے اسے مالی، ذہنی، خاندانی بے فکری دی اور اتنی رحمت کہ وہ جوئے کی لت سے آزاد اور دنیا کے چار عظیم ناولوں کی تصنیف سے فارغ ہو چکا تھا۔

مگر دستوئیفسکی کے اس عشق خانہ سازی کی کہانی اتنی سادہ نہیں ہے۔

ہزار نکتہ دریں کاروبارِ دلداریست

عورت اور دستوئیفسکی

اس کا تصوّر، سایہ اور تاثر

کسی کی شخصیت کے باطن کا سراغ لگانے میں یہ اطلاع بھی کام آتی ہے کہ صنفِ مقابل کے بارے میں اس کے تصورات، گفتار اور اطوار کا کیا حال ہے۔

دستوئیفسکی اس پہلو سے جتنا پیچیدہ ہے اتنا ہی واضح بھی، عمل جتنا ڈرامائی ہے، اسی قدر انسانی ہمدردی میں ڈوبا ہوا بھی۔

عورتوں کے بارے میں اس کے تصورات ذہن اور تجربے کے ساتھ برابر وسیع ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ عمر کے آخری دور میں عورتوں کی آزادی اور روشن خیالی کی تحریک کا بے باک حمایتی بن گیا۔

بچپن گھر کے بند ماحول میں گزرا، جہاں ماں اور بھائی بہنوں کے سوا کسی کا گزر مشکل تھا، لڑکپن بورڈنگ اسکول میں، نوجوانی قبل از وقت سنجیدگی میں، عینی گواہ بتاتے ہیں کہ انجینئرنگ اسکول سے آخری امتحان پاس کرنے کے بعد جو آٹھ سال پائے تخت میں گزارے (۱۸۴۰ء ۔ ۱۸۴۸ء) اور جن میں تھوڑی بہت شہرت اور عزت بھی کمائی، وہ صنفِ نازک کے کسی شدید جذبے سے بالکل خالی گزرے، تنگ دستی اور مطالعے دونوں کی شدت نے اور کسی شدت کے لئے گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔

انھی دنوں جرمن ڈاکٹر ریزن کامپ جو تقریباً سال بھر پیٹرسبورگ کے فلیٹ میں آدھے کا شریک رہا، اور اس کا کمپاؤنڈر دونوں نے خود نوشت سوانح میں دستوئیفسکی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورتوں کی طرف سے وہ بالکل بے نیاز رہتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بیزار سا تھا؛ تاہم عورت یا لڑکی کے کردار جو اس کی ابتدائی تحریروں میں آتے ہیں وہ بھلے سے ہیں۔ دکھی اور سیدھے سادے۔ جیسے "بچارے لوگ" کی "واروَرا" کہ محبت کا احساس اور اعتراف کرتے ڈرتی ہے، محبت اس کے لئے زندگی میں ثانوی چیز ہے۔ اور جہاں شادی طے ہوتی ہے چپ چاپ مان لیتی ہے، گویا یہ بھی ایک رسم ہے جسے جوں کا توں قبول کر لیا جاتا ہے۔ تب تک دستوئیفسکی جس روسی عورت سے آگاہ تھا وہ ایسی ہی ہوگی۔

مصنف کی عمر ۲۵ سال ہے جب اس نے "ذلتوں کے مارے لوگ" کی "نتاشا" کا پیکر تراشا۔ بچپن سے نتاشا کی شادی "وانیا" سے (جو ناول کا مصنف ہے) طے تھی، لیکن وہ ایک اور کھلنڈرے،

ن موجی زئیس زاویے کی محبت میں گرفتار ہوکر گھربار اور ناموس سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ پچھلے منگیستر کو اپنا
مونس وغم خوار بنا لیتی ہے۔ واَنیا اپنی محبت کو اس عجیب وغریب "ہمدردانہ" رول میں نثار کر دیتا ہے اور
رقابت یا انتقام کے جذبے سے پاک آڑے وقتوں میں کام آتا ہے۔

پوشکن نے بھی دس برس پہلے روسی ادب کو ایک "نتاشا" عطا کی تھی جو بزرگوں کی عزت آبرو کی خاطر
پہلی محبت کو قربان کر دیتی ہے اور اپنے عمر رسیدہ شوہر کی آن قائم رکھتی ہے، مگر دستوئیفسکی کی نتاشا خود کو محبت
کے طوفانی جذبے کے حوالے کر کے اپنے محبوب کے چھچھورپن پر شفقت کا آنچل ڈال دیتی ہے۔ بالآخر اسے کھو دیتی
ہے مگر حرفِ شکایت لب پر نہیں لاتی۔

غور طلب بات ہے کہ دستوئیفسکی نے اپنے پہلے اور بڑے ناول میں اس نتاشا کی تصویر اتنی احتیاط، سادہ
پُرکاری اور ہمدردی سے بنائی ہے کہ ہم اُس کے عشق کی ناکامی اور واَنیا کی قربانی، دونوں کو خوشی خوشی قبول
کر لیتے ہیں۔

پھر "جرم وسزا" کی سونیا ہے، دنیا کی نظر میں آبرو باختہ اور رقاتل رسکول نیکوف کی نگاہ میں بے قصور گہری
انسانیت کی، ذاتی قربانی اور دردمندی کی منھ بولتی مورت۔ ایک دن جب وہ جھلا کر اسے بھیانک انجام کا طعنہ
دیتا ہے کہ جس خاندان کا پیٹ پالنے کی خاطر تم یہ ذلیل مشقت گوارا کرتی ہو، اُسے بربادی سے بچا نہیں سکتیں اور
چھوٹی بہن بھی بڑی ہوکر تمہارے ہی نقشِ قدم پر چلے گی! تو سونیا بلبلا اُٹھتی ہے۔ جیسے اُس کے ہمدرد
اور ہمراز نے پیٹھ میں خنجر بھونک دیا ہو۔

"نہیں، نہیں۔ یوں نہ کہو۔ خدا نہ کرے، ہرگز.....!"

اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

رسکول نیکوف تیزی سے اُس کے قدموں پر جھکا اور پاؤں چوم لیے۔ اُٹھا اور بولا،

"میں تمہارے آگے نہیں... بنی نوع انسان کے تمام صبر اور مصائب کے آگے سر جھکاتا ہوں"

دستوئیفسکی کے یہاں شروع کے ۴۶، ۷ ۴ سال تک عورت بنی نوع انسان کے صبر اور مصائب کا مجسمہ
ہے؛ مصنف اس صبر کی داد دیتا ہے۔ اُس کے آگے "احتراماً" سر جھکاتا ہے، اور "صبر" میں شریک ہوتا ہے۔
بعد کی عورت ایک پارہ ہے۔ جو کسی حال پر نہیں ٹھیرتا، حرارت سے اڑتا ہے اور سرد مہری سے جمتا یا جمود
میں مبتلا ہوتا ہے۔ شرارت اور سازش کا پیکر ہے، وفا اور بے وفائی کا مرکب ہے، شدید محبت اور شدید تر نفرت
کا مجموعہ ہے۔ اور ایسی تمنا کا مجسمہ جس کا کوئی اور چھور نہیں۔

یکے بعد دیگرے آنا دیستریئونا اور پولینا سسلوو ا کے عشق میں گرفتار ہو کر دھوکے اور ٹھوکریں کھا کر مصنف نے جانا

کہ وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں رنگ تو ضرور ہے، لیکن خود اس دلکش وجود میں کتنے سارے رنگ گھُلے ملے ہیں، کوئی نہیں بتا سکتا۔

تاہم رفتہ رفتہ پیچیدہ ہوتی ہستیوں کے درمیان ہر ایک ناول میں کہیں نہ کہیں وہ عورت موجود ہے جس کے ذکر سے کاغذ نم رہتا ہے جس کے دُکھ اور سادگی میں مصنّف شریک نظر آتا ہے۔

ذاتی زندگی میں ہر طرح کے ستم جھیلنے کے باوجود دستوئیفسکی عموماً عورت ذات سے خصوصاً رُوس کی ناری جاتی سے بہت پُر امید رہا، وہ اُسے قومی صفات کی امانت دار، عقیدے اور ایمان کی ضمانت اور سماجی ترقی کا سب سے اہم پُرزہ اور اپنے نیم فلسفیانہ نظریے کی تعمیل کا مرکز سمجھتا اور بار بار اس کا اعلان کرتا رہا ہے۔

تین پہلوؤں سے اِس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے:

جن جن عورتوں اور لڑکیوں کو اُس نے جی جان سے چاہا وہ اپنے اپنے ماحول کی غیر معمولی ہستیاں تھیں۔ آنّا دمتیریئونا کو، اس کی ناکام شادی اور نالائق اولاد نے توڑ ڈالا تھا۔ ورنہ وہ نہایت سلیقہ مند، نفاست پسند اور آس پاس کے بھدّے پس منظر میں ایک ممتاز خاتون تھی۔ بے وفائی کے مستقل شبہ کے باوجود اس کی قدر کرنے میں دستوئیفسکی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یوں بھی وہ ایک تشنہ کام محبت کی اتفاقی آزمائش تھی اور پہلا تجربہ۔ دستوئیفسکی کی نظرِ انتخاب جب بھی ٹھیری، نہایت ہونہار اور حوصلہ مند لڑکیوں پر ٹھیری: پولینا سُسلووا آزادانہ جینا اور مرنا اور ہر قیمت پر اپنی انفرادیت کا سکّہ بٹھانا چاہتی ہے۔ دستوئیفسکی کے ساتھ یورپ گھومنا طے کرتی ہے۔ مصنّف نے دیر کی، وہ رُوس سے مقررہ وقت پر نکل گئی۔ پیرس میں نئے نئے دوست بنائے۔ کہیں ٹھوکر کھائی، کہیں زمانے کی انگشت نمائی کو ٹھوکر ماری۔ اس کی سرکشی نے زندگی سے ہار نہیں مانی۔ دستوئیفسکی کو اس نے چاہا نہیں، لیکن غیر معمولی ذہن کے مصنّف کی تصویر فریم میں لگی رہنے دی کہ یہ بھی آزادانہ اور سرکش وجود کی ایک ادا تھی۔ چاق چوبند پولینا نے چالیس بہاریں گزار لینے کے بعد اپنے سے سولہ برس چھوٹے اہلِ قلم تنقید نگار (رازنوف) سے پہلی اور آخری بار شادی کی اور چھ سال بعد جب اُس سے منھ پھیرا تو وہ اسے پھر سے منا لینے کی خاطر دَر بَدر پھرتا رہا۔ ایسی مقناطیسی شخصیت تھی اُس عورت کی!

عمر کے آخری دَور میں جب اُس نے شہر سے دُور دیہات میں نئے قسم کا ایک بورڈنگ اسکول کھولا تو انسپکٹر آف اسکولز نے اُس کے متعلق اپنی رپورٹ میں لکھا:

> یہ عورت رنگین چشمہ لگاتی ہے۔ بال کٹواتی ہے، خیالات بڑے آزاد ہیں، گرجا گھر کبھی نہیں جاتی ــــ یہ بھی کہ غیر ممالک میں سرکار کے مخالفین سے خط و کتابت رکھتی ہے۔

پولینا اور دمتیریئونا، دونوں سے اُداس ہو کر دستوئیفسکی نے جس انّا گرد فسکایا پر ڈورے ڈالے، وہ بعد میں

فرانس پہنچی اور ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون کی انقلابی جنگ میں شریک ہوئی۔ ژینے (Jeanne) کے نام سے جس ولولہ انگیز سرفروش عورت کا ذکر کتابوں میں آیا ہے، وہ یہی دستوئیفسکی والی آشنا تھی۔ جس سے وہ جیتے جی خط وکتابت کرتا رہا۔ اس کی چھوٹی بہن سونیا جو لڑکپن کے ہاتھوں دستوئیفسکی کی محبت میں سلگنے لگی تھی لیکن مصنّف کے تغافل نے اس جذبے کو بجھا دیا آگے چل کر روس کی سائنسی تاریخ میں علم ریاضی کی اوّلین خاتون ثابت ہوئی۔ بعد کی یادوں میں لکھتی ہے کہ دستوئیفسکی خطوں میں اُسے برابر مشورے دیتا اور ہمت بڑھاتا رہا۔ بے خانماں مارفا براؤن گوناگوں تجربات کی شوقین، دیس بدیس گھوم کر زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے کی شکستہ آرزومند دستوئیفسکی کی التفات اور عنایات کی شکر گزار رہی۔

جو لڑکیاں اس سے رجوع کرتی یا اپنے معاملات میں مشورہ طلب کرتی تھیں، ان کا کیریئر بنانے میں اور اُن کی ترقیوں کی روداد اوروں کو سنانے میں بھی دستوئیفسکی بڑا فیاض تھا۔

جن دنوں میں ترک سلاف جنگ چل رہی تھی، نرسوں کی ضرورت پڑی تو دستوئیفسکی نے بڑی شان سے لکھا کہ فلاں لڑکی جو اپنی مشکلات میں مشورے لینے آئی تھی، فوج میں اپنے زخمیوں کی خدمت کرنے نکلی ہے اور یہ وعدہ کر گئی ہے کہ اپنی تعلیم سے بھی غافل نہ رہے گی۔" یہ ہے نئے دور کی نمائندہ لڑکی، ایمان دار، کھری اور خوددار، پاکیزہ سرشت جسے یہ خوف نہیں کہ ارد گرد کی بیہودگی اُسے داغ دار کر سکے گی۔"

"مصنّف کی ڈائری" میں اُس نے جا بجا عورتوں کے بے باک عمل اور آزادی کی تحریک کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں ایک مقام پر وہ لکھتا ہے:

> روسی سماج [یورپ کو پیش آنے والے] خطرات سے محفوظ رہے گا اور تازہ دم ہوگا بڑی حد تک روسی عورت کی بدولت۔ پچھلی جنگ کے بعد جس میں روسی عورت اپنی تمام شرافت، سنجیدگی اور بے غرضی کے ساتھ سامنے آئی، اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ شان دار مستقبل کی مالک ہے۔ ایک دن آئے گا کہ دقیانوسی تعصبات دُور ہو جائیں گے اور اُجڈ، روسی اپنے سورماؤں کی ماں اور بہن کو، روسی مرد کی خاطر جان قربان کرنے والی کو اس کا صحیح مرتبہ دینا سیکھ لے گا۔

اس سے پہلے (جون ۱۸۷۶ء) وہ عورتوں میں روشن خیالی کی لہر کا استقبال یوں کر چکا تھا:

> گزشتہ بیس سال کے دوران روسی عورت میں نئی زندگی کے آثار قطعی ظاہر ہوئے ہیں۔ اس میں جو ہمہ نظر آتا ہے، انتہائی شان دار ہے، باوقار اور بے باک ہے۔ شروع سے ہی اس کے تیور قابلِ احترام ہیں یا کم از کم یہ کہ لوگ اس پر سوچنے لگے۔۔۔۔۔
>
> ۔۔۔۔۔ اس عرصے میں روسی مرد غاصبانہ حرکتوں، کلبیت، اور مادیت پرستی کی عیاشی میں بری طرح مبتلا ہوا

لیکن عورت ثابت قدم رہی اور "خیال" (عقیدے) کی سچی تعظیم اور اس کے فرائض کے بجالانے میں زیادہ دیانت دار نکلی۔

....

آئندہ اس سلسلے میں اعلا تعلیم بہت کار آمد ثابت ہوگی۔ اگر سچے دل سے پوری طرح عورت کے لیے اعلا تعلیم اس کے ساتھ ملنے والے تمام حقوق سمیت مان لی جائے تو روس پھر ایک بار بنی نوع انسان کی نئی اٹھان کے زبردست کاموں میں سارے یورپ سے آگے ترقی کے زبردست اور اچھوتے قدم اٹھائے گا۔

دستوئیفسکی کے ان تصورات کی قدر تب کھلتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا فرنچ پیش رَو بالزاک جو نسوانی صفات کا نباض ہونے میں ماہر تھا اور اپنی بدصورتی کے باوجود یکے بعد دیگرے، بلکہ بیک وقت کئی کئی عورتوں کو اپنا مبتلا رکھتا تھا، عورتوں کی سماجی آزادی اور سیاسی سرگرمی سے کچھ خوش نہیں۔ وہ انھیں اپنے اپنے گھر میں صرف مرد کی خاطر مدارات اور اُس کی سیوا کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔

دستوئیفسکی نے نئی روسی عورت کا تصور یورپ کی ہی نہیں بلکہ پوری انسانی برادری کی ترقی کے رنگ میں کیا ہے اور جب یورپ میں اُسے آدرش کی کوئی مورت نظر آتی ہے تو جی کھول کر داد دیتا ہے۔

۱۹ ویں صدی کی تیسری چوتھائی دہائی میں فرانس کے ادبی سیاسی مطلع پر غیر معمولی ذہانت کی بے باک شاعرہ چھا جاتی ہے۔ ژورج ساں (George Sand) جس کے سرکش کلام کھلے اور برتاؤ کا چرچا پُرانی چال کے روسی جرنلسٹوں اور اخلاق کے پاسبانوں کو چراغ پا کر گیا۔ کسی نے کہا ژورج ساں منھ میں چُرٹ دبائے، فُل بوٹ اور پتلون پہنے پیرس کی سڑکوں پر گھومتی پھرتی ہے؟ دستوئیفسکی کے معاصر سینکوفسکی نے لکھا کہ شراب کی محفلوں میں مردانہ شریک ہوتی ہے اور "آزادانہ شوہریت" کا پرچار کرتی ہے۔ غرض روس کے نوجوان حلقوں میں جتنی اس کی مقبولیت بڑھتی اتنی ہی اس کے خلاف افواہیں پھیلائی اور باور کرائی جاتیں۔

۸ جون ۱۸۷۶ء کو بہتر سال کی عمر میں اس بھولی بسری شاعرہ اور ناول نگار کا پیرس میں انتقال ہوگیا۔ دستوئیفسکی نے مصنف کی ڈائری میں اس کی یاد میں دو زبردست نوٹ لکھے ہیں؛ ایک ماتمی، دوسرا تنقیدی ــــــ

"عورت کی شخصیت کے تعلق سے مصنف کی عمر بھر کی ذہنی کمائی گویا ان چند صفحوں میں اُبھر آئی ہے اور بے محل نہ ہوگا اگر ہم ہاتھ کھول کر اصل کے اقتباس چن دیں۔ شاعرہ ژورج ساں کو وہ اپنا معاصر شمار کر کے غم کے دو آنسو ٹپکاتا ہے اور پھر روس میں اس فرنچ شاعرہ کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ہم روسی [ایک نہیں] دو مادرانِ وطن رکھتے ہیں ـــ روس اور یورپ..... روس کے سلاف

پرست اس بیان پر ناک بھوں نہ چڑھائیں ..... دراصل وہ ہم سے شدّت کا، ثابت قدمی کا اور زیادہ ذمّہ دار روسی ہونے کا تقاضا کرتے ہیں اس لئے ہیں کہ ان کے خیال میں انسان کے یونی ورسل (عالمی) ہونے کا تصور ایک روسی کی خاص ذاتی صفت اور امتیازی حیثیت ہونی چاہیے۔

روس اور یورپ کے اس رشتے کی مثالیں دیتے ہوئے دستوئیفسکی بتاتا ہے کہ یوروپ سے جو کچھ [تہذیب اور سائنس] ہم نے حاصل کی ہے وہ غلامانہ نقالی نہیں تھی بلکہ اسے اپنے گوشت پوست میں جذب کرلیا اور قطعی اپنالیا۔ یوروپ کو خبر بھی نہیں کہ ہم نے اس کے بہترین عناصر کو کس طرح "روسیا" لیا ہے۔

..... میں زور دے کر یہ بات دُہراتا ہوں کہ ہر ایک یوروپی شاعر، مفکّر اور انسانی علوم کا نمایاں شخص [باقی تمام ممالک سے زیادہ] روس میں قریب سے جانا پہچانا اور اپنایا جاچکا ہے مثلاً شکسپیر، بائرن، والٹر اسکاٹ، ڈکینس .....

..... عالمی ادب کے ساتھ یہ روسی برتاؤ اپنی مثال آپ ہے اور دنیا کی تاریخ میں کسی قوم میں [باہر کے ادب کے ساتھ اپنے پن کی] یہ خصوصیت نہیں ملے گی۔

دوسرے نوٹ میں وہ اصل موضوع پر آتا ہے کہ ۱۸ ویں صدی کے بعد سے یوروپ کی ہر ایک ذہنی تحریک ہاتھوں ہاتھ روس پہنچ جاتی تھی، دانشوروں کے اوپر والے حلقے سے ہوتی ہوئی عام پڑھے لکھے یا دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں پھیل جاتی تھی۔ ژورج ساں کی شاعری اور اُس کے ناولوں کا بھی یہی ہوا "میری عمر سولہ برس کی ہوگی جب اس کے شروع کی تصنیف ناول KOK دلا پڑھا۔ رات بھر بخار کی سی حالت رہی"

...... اور تو اور، ڈکنس تک، جو انھی دنوں روسی [ترجمے کے] لباس میں ظاہر ہوا، ہماری پبلک میں جارج ساند کی مقبولیت نہ پا سکا" یوروپ میں پُرانے حاکموں اور جابروں سے بیزاری کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی اور نئی آواز اُٹھی تھی کہ سیاسی اقتدار سنبھالنے والوں (حاکم حلقوں) کی تبدیلی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہونے والا۔ ایک ایسا انقلاب آنا چاہیے جو ریڈیکل اور سوشل ہو۔ ژورج ساں اس نئی آواز کی شاعرہ تھی مگر چوں کہ خود عورت تھی اس لئے ناولوں میں ہیرو کے بجائے نئی ہیروئن کی تصویر اُبھارتی رہی .....

" اس کی یہ ہیروئنیں قربانی اور سرفروشی کی دلدادہ ہیں ....

اس نے اپنی تصانیف میں (جن کا میں دل سے قدرداں رہا ہوں) ایسا نو عمر نسوانی پیکر تراشا ہے جو کھرا ہے، سچّا، ایمان دار مگر ناتجربہ کار ہے، اس میں وہ خوددارانہ پاکیزگی موجود ہے جو بدی یا گندگی کا سامنا کرنے سے نہ تو ڈرتی ہے، نہ اُس سے آلودہ ہوتی ہے۔ چاہے وہ کردار (نسوانی پیکر) خود اس کیچڑ میں اتفاق سے دھنس جائے ......

ژورج ساں اپنی نظموں کا انجام خوشی اور کامیابی پر دکھانا پسند کرتی ہے، جہاں معصومیت، خلوص اور پُر شباب، نڈر اطمینان بالآخر کامیاب ہوتا ہے۔ کیا اس طرح کی تصویریں کسی سماج میں شک اور شبہ اور خوف و اضطراب پیدا کر سکتی ہیں ؟"

دستوئیفسکی ہمیں جتاتا ہے کہ یہ صفات عورت ذات کی آزادی کی لہر کو اونچا اُٹھانے والی اور اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے والی ہیں؛ یہ سماجی ترقی کی ضمانت ہیں۔ اگرچہ ژورج ساں نے دینِ مسیحی کا اقرار نہیں کیا۔ تاہم اپنے ہم عصر فرانسیسی اہلِ قلم میں غالباً سب سے زیادہ مسیحی وہی تھی کیوں کہ اس کا سوشلزم، عقیدہ، اُمیدیں اور آدرش سب کے سب انسان کے اخلاقی احساس پر قائم تھے، دنیائے انسانیت کی روحانی تشنگی پر..."

"... لہٰذا فکر اور جذبہ — دونوں میں ہی وہ مسیحیت کے بنیادی تصورات سے۔ یعنی انسانی شخصیت اور اس کی آزادی (ساتھ ہی اُس کی ذمہ داری) کو تسلیم کرنے سے ہم آہنگ ہو گئی تھی" کہا جاتا ہے کہ وہ بہترین ماں، جیتے جی اپنے ہمسایہ کسانوں کی بہترین غم خوار، مددگار اور بہترین دوست ہو کر مری۔ یہ وہ عورت تھی جس نے زندگی میں الزام سہے کہ اپنی اولاد کو یار آشنا کے حوالے کر کے خود بے لگام پھرتی ہے اور بے لگام رہنے کا پرچار کرتی ہے۔

"مصنف کی ڈائری" میں اور کئی نسوانی شخصیتوں کا بڑے تپاک سے ذکر آیا ہے، لیکن ژورج ساں کی موت پر لکھتے وقت دستوئیفسکی نے عورت کے تصور میں ایک ہی مقام پر خودداری، معصومیت، ایثار، دیانت، ہمت اور آزادانہ شخصیت کی صفات اُبھاری ہیں اور یہ وہی صفات ہیں جو وہ عمر بھر اپنے رفیقِ سفر میں تلاش کرتا پھرا۔ عجب نہیں کہ اسی تلاش میں وہ بار بار اپنے سے بہت کم عمر لڑکیوں پر مرمٹتا تھا؛ آننا کروفسکایا اس سے ۲۲ سال چھوٹی، صوفیا ایوانونا (جس سے وہ پدرانہ محبت کا دعوا کرتا ہے) ۲۵ سال کم، پولینا سسلووا ۱۹ سال چھوٹی، مارفا براؤن کوئی ۱۶ سال بعد کی پیدائش تھی اور تلاش کا آخری نقطہ آننا سنیت کن — ۴۶ برس کے جہاں دیدہ مصنف کے سامنے محض بیس برس کی بچی تھی۔

گھر گرہستی

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، دستوئیفسکی کو بچپن سے گھر کی راحت نصیب نہ ہوئی تھی۔ باپ کے مزاج کی سختی، بے درد ڈسپلن، آس پاس مریضوں کا ماحول اور محلّے والوں سے بے تعلقی۔ پندرہ برس کا تھا کہ ماں مر گئی۔ آٹھ بچّوں کی ماں ۔ جو کثرتِ اولاد اور قلّتِ اسباب سے اُکتائی رہتی تھی۔ ۱۸ سال کا ہوا تو باپ کو کسانوں نے قتل کر دیا اور سارے خاندان نے چپ سادھ لی گویا ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔
گھر سے جیب خرچ بھیک کی طرح ڈانٹ پھٹکار کے ساتھ ملتا تھا جب ۲۲ سال کی عمر میں ملازمت ملی، پوری رقم ہاتھ میں آئی تو وہ اسے سنبھال کر خرچ نہ کر سکا۔ سال بھر بعد پیشہ ور اہلِ قلم کی آزادانہ معاش کی خاطر نوکری سے استعفا دے دیا۔

پہلا ناول اور چند کہانیاں چھپنے کے فوراً بعد (۱۸۴۶ء) جو دھوم ہوئی اس نے دماغ اور جیب دونوں کا توازن بگاڑا۔ جن عالی شان گھرانوں میں آمد و رفت ہونے لگی اُن کے آداب سے بے گانہ تھا، جی چاہا کہ لباس، تراش خراش، گھر کی دیکھ ریکھ کا معیار بلند کرے۔ نوکر رکھا، اس نے ایک اور نوکرانی اور اس کا پورا خاندان گھر میں بھر لیا۔ بھائی نے کہہ سُن کر ایک نوجوان جرمن ڈاکٹر کو کئی کمروں کے اس فلیٹ میں رکھوا دیا تاکہ کرائے کا بار بھی بٹ جائے اور نوجوان، فضول خرچ بھائی کو "جرمن کفایت شعاری" کے گُر بھی سکھا دے۔ مریض گھر پر آتے تو دستوئیفسکی ان کی ضروریات کا بھی خیال رکھنے لگا۔ کسی کو دوا، دارو کے پیسے دیتا، کوئی بٹوا چوری کر کے لے جاتا۔ کوئی اسے باتوں میں لگا کر قیمتی وقت چُرا لیتا۔

محلّے میں پرچون کی دکانوں سے اُدھار پر سامان مل جایا کرتا تھا، ہفتوں اسی قرض پر بسر ہوتی ـــ پھر گھر کے نوکر بھی صاحب خانہ کے حساب میں بے حساب قرض لانے لگے۔ سَو دو سو روپیہ اُدھار لے کر مہینے کے آخر تک کام چلتا اور تنخواہ آتے ہی پھر جیب خالی۔ پھر وہی فاقہ مستی اور قرض خواہوں سے رُوپوشی،

سال بھر میں کفایت شعار جرمن ڈاکٹر اس گھر سے اُٹھ گیا اور اپنی ڈائری میں اندراج کیا کہ فیودر دستوئیفسکی ہمیشہ مقروض اور کوڑی کوڑی کو محتاج رہے گا۔ اسے گھر سنبھالنا کبھی نہ آئے گا۔
انھی دنوں بے قرار فطرت اور حق کی تلاش ایسے سیاسی حلقوں میں لے گئی جہاں گھر بسانے

یا کسی بھی مقررہ پیمانے کو اپنانے سے سراسر انکار تھا۔ پھر چار برس سائبریا کے قید خانے میں گزرے اُن مجرموں کے درمیان جو اپنا یا کسی اور کا گھر اُجاڑ کر آئے تھے۔

باہر نکل کر ۳ سال فوجی بارک میں رہنا پڑا۔ بارک سے باہر کرائے کا مکان لے کر رہنے کی اجازت ملی تو ایسا مکان نصیب ہوا جس میں ایک بیوہ ماں تھی۔ دو جوان بیٹیاں اور اندھیرے اُجالے فوجی بوٹوں کی آمد و رفت۔ یہیں پہلی بار ایسے گھرانے میں اس کی پذیرائی ہوئی جہاں شراب کے وحشی شوہر سے زیادہ اس کی جوان بیوی مہربان تھی اور فیودر دستوئیفسکی ۳۳ سال کا الھڑ جوان مبتلا ہو گیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد صاحبِ اولاد بیوہ ماریا دمیتریُونا سے — جو خودکشی اور طرف مائل تھی — شادی پر اصرار در اصل گھر بنانے یا بسانے کی تمنّا کا اظہار نہیں بلکہ جنونِ عشق کو اس کی انتہا تک پہنچانے اور نئے قسم کے تجربے میں گہرائی تک اُتر جانے کی کوشش تھی۔

دستوئیفسکی کی بیٹی نے لکھا ہے کہ کوزنیتسک کے اسکول ماسٹر ویرگونوف سے ماریا کے درپردہ تعلقات اس شادی کے بعد بھی برقرار ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ دستوئیفسکی ادھر سے بالکل بے خبر ہو — لیکن اپنے چھچھورے رقیب سے اس کا برتاؤ مہربانی اور ہمدردی کا تھا — یہی برتاؤ بعد کے ناولوں میں یہاں تک کہ عین انھی دنوں لکھے جانے والے ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" میں واحد متکلم ہیرو کا اپنے رقیب سے ہے۔

پھر ماریا کا مسلسل سوگوار اور بیمار رہنا، اس کا چڑچڑا پن، اس کے بیٹے کی آوارگی اور نکما پن، جسے دستوئیفسکی قریب یا دُور رکھ کر اپنی سگی اولاد کی طرح عمر بھر پالتا رہا — اور بیمار بیوی کو گھر چھوڑ کر دو بار بے تحاشا یورپ کے دورے پر نکل جانا، دوسری بار ایسی غزالہ کے تعاقب میں جو خود کسی چار دیواری میں ٹھیرنے والی نہیں تھی — صاف علامتیں ہیں اس بات کی کہ دستوئیفسکی نے اپنے لئے جس نہج کی زندگی طے کی تھی اس میں گھر گرہستی کا خانہ نہیں رکھا تھا۔

خانہ داری کی زندگی سے دستوئیفسکی کی بے رُخی کا ایک دردناک رُخ اور بھی رہا — وہ تھے اس کے رشتہ دار جن میں بعض تو اقارب نہیں، عقارب نکلے۔

پہلی بیوی ماریا اور بڑے بھائی میخائیل کا — جو واقعی دست و بازو تھا — ایک ہی سال (۱۸۶۴ء میں) انتقال ہو گیا۔ دونوں قلاش مصنف کی گردن پر قرضہ چھوڑ کر مرے۔ ماریا نے پہلے

شوہر سے اپنا ایک نا اہل بیٹا بھی چھوڑا جس کی عیش پسندی کا یہ حال تھا کہ دستوئیفسکی کی ملک سے غیر حاضری کے زمانے میں اس کے مکان پر ایک بازاری عورت لا کر رکھ لی اور خرچ بڑھا لیا۔

میخائیل کی نا وقت موت نے رسالے کے سلسلے کے قرض مستقل کر دیے، پھر بھائی کی بیوہ اور چار بچے ایک خاندان۔ اس کے علاوہ بھائی کی ایک رکھیل اور اس کا بچہ دوسرا خاندان — پھر ۲۵ ہزار روبل کا قرض — جو بھائی نے بطور ہُنڈی لیا تھا۔ اور سب پر مزید چھوٹا بھائی نکولائی جو نکھٹو ہونے کے سوا شراب خواری کی علت میں گرفتار تھا۔

یوں مرگی اور بواسیر کے مستقل مریض دستوئیفسکی کو تین مختلف خاندانوں کے ۱۰۰۹ آدمی کا پیٹ پالنا اور سارا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ ہم یہاں "بوجھ" کے ساتھ "ناچار" کا لفظ اس لیے نہیں بڑھا سکتے کہ اپنا دُکھ بڑھانے اور دوسروں کے گناہوں کا بوجھ (شوق سے) اُٹھا لینے میں اسے "لذتِ آزار" ملتی تھی جو بالآخر اس کے "مسیحی مشن"، تصور کا بنیادی پتھر ثابت ہوئی۔ انسانی فطرت کا، بلکہ غم کی فطرت کا زبردست نبّاض ضرور سمجھتا ہوگا کہ ان حالات میں اور پھر تنگ دستی میں گھریلو راحتوں سے فیض یاب ہونے کی کوئی ریکھا اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

مگر جیسا کہ اس کے قریب قریب تمام ناولوں میں ایک نہ ایک اہم کردار اپنا عکس یا برخلاف بھی اپنے وجود میں یا ساتھ ساتھ لگائے پھرتا ہے — اسے وہ "ڈبل" کہتا ہے اور اسی عنوان کی کہانی میں "ڈبل" کے تصور پر زور دیا ہے — خود دستوئیفسکی کا "ڈبل" بھی اس میں چھپا بیٹھا تھا۔

ستم ظریف شسلووا سے آس ٹوٹ چکی ہے، پہلی بیوی کو دفنائے ہوئے دو سال گزر چکے۔ قرض خواہ دروازے پر دستک دے رہے ہیں، دست نگر عزیز ہاتھ پسارے کھڑے ہیں پیشگی دینے والا پبلشر کتکوف تقاضے کر رہا ہے اور دستوئیفسکی اپنے عظیم ناول "جرم و سزا" کا اوّل باب لکھ رہا ہے۔

پیٹرسبورگ میں چین نہ ملا تو وہ ماسکو چلا آیا۔ شہر میں جی نہ لگا تو مضافات کی بستی "لیوب لنا" آ گیا جہاں اس کی چہیتی بہن ویرا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ قصباتی بنگلے میں ٹھہری ہوئی تھی — بچے بھی بڑے ماموں سے ہل گئے۔ بہنوئی نے بھی خاطر داری کی، بہن نے بھی۔

یہ پہلا خوش و خرّم خاندان تھا جہاں بے فکری سے دو مہینے جم کر لکھا — اور ناول تکمیل کو پہنچنے لگا تو وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی شے کے چھوٹ جانے کا احساس ہوا — خاندانی زندگی کی سہانی دھوپ سے چھوٹنے کا۔

اس لمحے دستوئیفسکی کی جو ذہنی کیفیت ہوگی وہ دُو سال بعد لکھے گئے نہایت مکمل ناول " سدا سہاگی " (..........) میں ایک کردار کی زبانی ادا ہوئی ہے جہاں وہ ایک ایسے ہی گھرانے سے رخصت ہوتا ہے :

> وہ ...... یہ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ اگر دنیا میں اور رہنا ہوا تو کچھ عرصے بعد یہیں آ بسے گا ، انہی میں مل کر رہے گا ، کبھی جدا نہ ہوگا ۔ اور یہ بات بار بار اس کے دماغ میں گھومتی رہی ۔

تین مہینے بعد اُس نے خواب میں دیکھا کہ لکڑی کے پُرانے بکس میں ، کاغذات ٹٹولتے وقت اتفاقاً ایک ہیرے کی کنی نکل آئی ۔
" ہیرے کی یہ کنی " واقعی پُرانے کاغذات کے پلندے میں سے نکلی اور خالی انگوٹھی کا نگینہ بن گئی ۔ آننا سنیت کِن ۔

" دیدیم زورِ بازوئے ناآزمودہ را "

آننا سنیت کِن ، شرمیلی ، بردبار اور ہوش مند اسٹینوگرافر کے اوصاف " بیوی " کے موٹے لیبل تلے چھپنے والے نہیں تھے :

> " اوّل سے آخر تک وہ اس کے فن کارانہ کمال کی بے لاگ عقیدت مند تھی ۔ اس کی نرس ، سکریٹری ، کاروبار کی چُست منیجر اور بالآخر اس کی پبلشر بن گئی ..... "

ان سب اوصاف کے ساتھ اس " ناآزمودہ بازو " نے گویا اُبلتے ہوئے لاوے کو اپنے بس میں کر کے گھر کا چولھا بھی روشن کر لیا اور عالمی ادب کو ایک سرچ لائٹ بھی مہیا کر دی ۔
فیودور دستوئیفسکی جیسے بے چیدہ اور عمر رسیدہ " کھڑ یل " کے ساتھ بسر کرنا ، وہ بھی ایسے خاندان میں جہاں چھوٹے بڑے سبھی اس کے التفات اور اوقات پر دانت لگائے بیٹھے ہوں ، حیلوں اور تدبیروں کا محتاج تھا ۔ آننا گری گوریونا سنیت کِن نے شروع چند روز کی الجھنوں میں پڑ کر اپنا منصوبہ سوچ لیا ۔

> "...... ہاں ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجھے فیودور کی حفاظت کرنی ہے ، دوسروں سے ہی نہیں بلکہ خود اُسی سے اُن کا بچاؤ ۔ فیودور میں نام کو بھی اپنے اوپر قابو نہیں ۔

وعدے پر وعدے کرتے گئے، قسمیں کھائیں تھے، لیکن کرنے کا وقت آیا تو اس کے برخلاف کر گزرے تھے......عجب انسان ہے، لیکن ہے کیسا شان دار......"

یہ جملے اس نے اپنی ڈائری میں سال بھر بعد وطن سے دور بیڈن (Baden) کے مقام پر لکھے ہیں۔ جہاں دستوئیفسکی ایک ایک پیسہ جوئے میں ہار آیا اور بیاہتا بیوی کے سامنے گردن جھکا کر کہنے لگا کہ نہ میں گرہست ہوں، نہ بن سکتا ہوں۔

آنا کو اپنے اس نئے بھرے پُرے گھر میں دُہری رقابتوں کا سامنا تھا۔ شوہر کا سوتیلا اور ناکارہ بیٹا پاویل (پاشا) سوتیلی ماں کو تنگ اور بدنام کرنے کے لئے نئی نئی شرارتیں کرتا۔ کبھی ماچس چھپا دے کبھی مہمانوں کے سامنے اُس کے پھوہڑپن پر طعنہ زنی کرے۔ بھاوج بھی ان گھریلو شرارتوں میں پاویل سے مل گئی۔ اوپر سے یہ لوگ فیودر کے کان بھرتے تھے جو خود اپنی دُھن میں مگن رہنے والوں کی طرح، کان کا کچا بھی تھا اور بے کینہ بھی —— ہر ایک کی بدگوئی سنتا اور پھر بُھول جاتا۔

گھر کے پُرانے مالکوں کو نئی مالکن سے جو آمد و خرچ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی، جلن ہونا قدرتی امر تھا۔ دوسری رقابت خود فیودر کا حساس مزاج۔ وہ عورتوں کی لگاوٹ اور تلوّن کا اتنی بار شکار ہو چکا تھا کہ اگر نو عمر بیوی خود اسی کے احباب یا ملنے جلنے والوں سے ہنس کر بات کر لیتی تو وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا اور تن بدن سے شعلے اٹھنے لگتے۔ مطلب یہ کہ وہ واقعی شوہر ہو چلا تھا۔

قرض خواہوں کو بھی سُن گُن مل گئی تھی کہ دستوئیفسکی کو "جرم و سزا" ناول کے کتابی ایڈیشن سے سات ہزار روبل نقد ملا ہے۔ وہ الگ دھمکیاں دیتے تھے کہ یا تو قرض ادا کرو، نہیں تو عدالت سے ڈگری لے کر سزا کرا دیں گے۔

آنا نے پہلے تو ان قرض خواہوں کو تھوڑی تھوڑی رقم کی قسط ادا کرائی اور دھمکی کا جواب دھمکی سے دیا کہ اگر مصنف جیل کی کوٹھری میں پہنچا تو آئندہ لکھنا پڑھنا بند —— اور ادائگی کی اُمید موہوم۔ پھر شوہر کو سمجھایا کہ صحت سب سے مقدم ہے۔ یوروپ چلتے ہیں۔ آب و ہوا کی تبدیلی اور ماحول کی تازگی سے صحت بھی بہتر ہو گی اور نئی تصنیف بھی سوجھے گی۔

سفر خرچ کے لئے پُرانے پبلشر کتکوف سے وعدے پر ہزاروں روبل رائلٹی پیشگی لے لی اور پھر قیمتی فرنیچر، پیانو، چاندی کے برتن اور اپنے زیورات بیچ ڈالے۔ ماں سے بھی کچھ رقم [جہیز کے بطور] لے آئی تھوڑی تھوڑی رقم ان حاجت مند عزیزوں کی جھولی میں ڈالی جن کے مطالبے سامانِ سفر کی تیاری دیکھ کر بے لگام ہو گئے تھے اور بے بس بھی۔

اس سے پہلے کہ خبر عام ہو اور روانگی میں کھنڈت پڑے۔ ۱۴ اپریل (۱۸۶۷ء) کی شام کو یعنی شادی کے عین دو مہینے بعد وہ تنہا شوہر کو لے کر پیٹرسبورگ سے برلن جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ خود مصنف بے خبر تھا کہ واپسی کب تک ہوگی اور واپس ہوئی سوا چار سال بعد — جب ناکارہ رشتہ دار تھک ہار کر اپنی اپنی معاش کی تدبیریں اختیار کر چکے تھے۔

شروع چار مہینے کے اس سفر کی روزمرہ روداد آننا گری گی یونا نے اپنی ڈائری میں درج کی ہے جس سے میاں بیوی کے چھوٹے چھوٹے معاملات، روز کی ہار جیت، جوئے کی میز، آمد و خرچ کا حساب، اُستسلو دا کے خفیہ خطوط اور ہول ناک افلاس کی تفصیلات درج ہیں۔ اور انھیں پر ڈائری تمام ہو جاتی ہے۔

۱۵ مہینے کی اس منھ مانگی جلاوطنی کے دوران جسے ہم کسی طرح سیر و سیاحت نہیں کہہ سکتے — ایسے ہفتے بھی گزرے جب نہ ہوٹل کا بل ادا ہو سکا، نہ کچھ کھانے کو ملا، نہ کہیں سے رقم آئی اور گھر کا کپڑا لتا بھی گروی رکھ کر دستوئیفسکی رولٹ کے پھیر میں گنوا آیا۔

مگر اس سفر میں دو واقعے ایسے ہوئے جن کے انجام نے دستوئیفسکی کو گرہست بنانے اور گرہستی کا سکھ پہنچانے میں اکسیر کا کام دیا:

ایک بار اُس نے اپنے ہارنے کی وجہ یہ بتائی کہ کھیلتے وقت بیوی کی طرف سے فکر لگی ہوئی تھی، خیال بٹ گیا اور وہ جوش میں غلط داؤ چل گیا۔ آننا اس کی خاطر ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی اور اس نے رولٹ کے ہنگامے میں اپنے شوہر کا حلیہ دیکھا کہ چہرے پر غضب کا تناؤ ہے۔ آنکھیں لال انگارہ، ہاتھ پاؤں بے قابو، گویا شراب خانہ خراب سر چڑھ گئی ہے، اور سب کچھ ہار چکنے کے بعد اُس پر پشیمانی کا دورہ پڑتا، خمار اُترتے ہی وہ کاغذ پھیلا کر رات رات بھر بیٹھتا اور لکھتا چلا جاتا۔ گویا ایک تلاطم کی تلافی یا تدارک دوسرے تلاطم سے کرتا۔

آننا نے بھانپ لیا کہ شوہر کے رُوپ میں جو شورش پسندجی رہا ہے اسے کھلی چھوٹ دی جائے کیوں کہ فوری نقصان کی راہ بالآخر دیر یا نفع کی جانب لے جانے والی ہے۔ نفع و نقصان کا یہ کھرا اندازہ شدید افلاس اور شدید جذبات کے نرغے میں ایک خاندان برباد جواری کی ہار اور ایک دوررس اور معاملہ فہم بیوی کی جیت ثابت ہوا۔

"...... ہم لوگ [بستر میں] لیٹ جاتے اور اپنی بے چارگی پر باتیں کرتے۔ کہتے کہ دیکھیے، آئندہ ہم ان

دنوں کو یاد کیا کریں گے کہ کیا وقت تھا، کیسی سخت گرمی، مالکِ مکان کے بچے چیخ چلا رہے ہیں۔ دن بھر کارخانے میں ٹھوکم ٹھاک چل رہی ہے۔ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ ہر چیز گروی پڑی ہے، آگے کوئی آسرا نہیں کہ انھیں چھڑا لیں گے، کمروں میں دم گھٹا جاتا ہے، گھنٹے ٹن ٹن بجتے ہیں۔ کوئی کتاب تک نہیں کہ ورق الٹیں [اور وقت کاٹیں] سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اگلے وقت کی روٹی جڑے گی کہاں سے .....‟

(۲۹ جولائی ۱۹۶۷ء)

دستوئیفسکی کے ضمیر پر نوجوانی سے ہی اصلی یا فرضی جرائم کا بوجھ تھا کہ وہ خود کو عذاب میں ڈال کر لطف اٹھا سکتا تھا ——— اب وہ اس کیفیت میں تنہا نہیں رہ گیا، شریکِ حیات اس کی شریکِ غم بن گئی اور چار سال بعد زندگی کے ایک بڑے عذاب سے صاف نکال لے گئی۔

آخری سین اسی کے ایک ہم وطن نقّاد کے لفظوں میں پڑھنے کے قابل ہے۔

مصنّف اپنی حاملہ بیوی کو ڈریسڈن میں چھوڑ کر ویس بڈن جوا خانے پر آپہنچا ہے اور واپسی کرائے کے سوا سب کچھ ہار چکا۔

”..... کاسینو میں وہ کھیل دیکھتا ہوا گھوم رہا تھا۔ دس بار چکّر گھوما اور جو قیاس کیا تھا وہی نمبر آیا۔ اب کیسے ضبط کرتا! اگر وہ بھی کچھ ہاتھ مارے اور جیب گرم کر کے گھر پہنچے تو لطف آجائے۔ آننا کے مُندے بھی گروی پڑے ہیں، وہ چھڑوانے ہیں [بازی لگائی] ساڑھے نو بجے جب وہ اس ہال سے نکلا، حواس گم تھے، آخری پیسہ بھی ہاتھ سے جا چکا تھا۔ دوڑا ہوا روسی پادری کی تلاش میں چلا، ضمیر کا بوجھ اتارنے؟ اعترافِ گناہ کرنے؟ رات کا اندھیرا تھا، راستہ نہ سوجھا، اجنبی گلیاں۔ بھٹک گیا۔ کہاں پہنچا؟ یہودیوں کے سناگاگ میں، سٹپٹا گیا .....‟

یہیں سے (۱۸۷۱ء کی گرمیوں میں) بیوی کو وہ مشہور خط لکھا جو اس نے شوہر کی وفات کے بعد اپنی ”یادِ رفتہ“ میں شامل کیا ہے اور جس میں یہ آخری وعدہ سچا نکلا:

.... آنیا، (پیاری) یقین کرنا، اب میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ قمار بازی میری گردن میں ایک زنجیر تھی [زنجیر نکل گئی] آج سے میں اپنے کام پر دماغ کھپاؤں گا اور راتوں کو بیٹھ کر (کام میں جُٹ کر) جوئے بازی کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں ......،

دوسرا واقعہ ہے پردیس کے ان ناگہانی حالات میں تیسرے وجود کی آمد جس نے رہی سہی دراڑیں بھر دیں۔

”...... ابھی بچّہ پیدا نہیں ہوا اور ہم دونوں ابھی سے اس کی محبت میں مبتلا ہیں۔‟

دستوئیفسکی کا خط ایک دوست کے نام

دستوئیفسکی کی آرزو تھی کہ بیٹی ہو۔ فروری ۱۸۶۸ء کے آخر میں، جب زچگی کا وقت قریب تھا۔ بیوی کی تکلیف اور پریشانی دیکھ کر اس مصنف کے ہاتھ پاؤں پھول گئے (جس کے ہر ناول میں بے دردی کا قتل یا خودکشی یا دونوں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں)؛ مرگی کا بہت سخت دورہ پڑا۔ دورے کے بعد سکون ہوا تو آنکھ لگ گئی۔ بیوی نے دردِ زہ کی حالت میں اُٹھایا کہ لپک کر دائی کو بلا لائے۔ اُس نے سر اُٹھایا، ہمدردی کے دو بول کہے اور پھر کروٹ لے کر سو گیا۔

دوسرے دن بیٹی نے جنم لیا، اسے پوتڑوں پر لٹانے میں، نہلانے میں وہ دائی کا شریک رہا، نام تجویز کیا "سونیا" اور گود میں اُٹھا کر خوشی کے مارے پکارنے لگا کہ — لو، ہماری سونیا ابھی سے مجھے پہچانتی ہے۔ جب ڈھائی مہینے کی ہوئی تو دستوئیفسکی نے عزیزوں اور دوستوں کو لکھا کہ وہ اتنا پہچاننے لگی ہے کہ، روتی ہو اور میں دوڑ کر پیار کر لوں تو چپ ہو جاتی ہے، گویا رو رو کر مجھی کو بلاتی ہے۔ یہ عشق بھی دیوانگی کی حدوں سے گزر رہا تھا کہ تیسرا مہینہ پورا کرنے سے پہلے ہی، ۲۴ رمئی کو، ہوا لگنے سے بچی مر گئی۔

وہ سوئزرلینڈ سے، وہاں کی آب و ہوا سے، ڈاکٹروں سے، پوری سوئس قوم سے بھڑک گیا۔ پہلی بیوی کی موت پر بھی دستوئیفسکی نے دوستوں کو درد بھرے خط لکھے تھے، لیکن اِس ننھی سی جان کی موت اس کے لئے زندگی کا سب سے بڑا حادثہ بن گئی۔

...... میں اب اس سونیا کو کہاں سے لاؤں؟ میں تو اس کی جان بچانے کے عوض سولی پر چڑھ جانے کو تیار تھا...کسی طرح دل کو قرار نہیں آتا .....پرسوں ہم ننھی سی قبر (کا یہ شہر) ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں سے کہیں بھی چلے جائیں گے۔

سال بھر نہ گزرا تھا کہ آننا نے پھر نئے مولود کی آمد کا اعلان کیا۔ اور اس بار دستوئیفسکی نے شروع سے ہی دادی نانی کی سی پیش بندیاں شروع کر دیں۔ دن رات نظر رکھتا اور خدمت کرتا۔ تالستائی کا ناول "جنگ و امن"، سامنے سے ہٹا دیا کہ کہیں بیوی نہ پڑھ لے (اس ناول میں پرنسس والکونسکا زچگی میں مر جاتی ہے) زچہ کی خوراک میں پرہیز کی تاکید اور تعمیل اپنے ذمے لے لی — اور جب اس کی دوسری بیٹی لیوبا پیدا ہوئی تو وہ کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا۔ لیوبا کی چیخوں میں سونیا کی صدا آ رہی تھی اور دوہری فطرت کے مصنف میں سوئے ہوئے شوہر اور باپ کو جگا رہی تھی۔ لیوبا بڑی ہوئی، زندہ رہی، اپنے باپ کی سوانح حیات لکھ گئی (اکثر نامعتبر) — لیکن جو دو عظیم ناول)

ان چار کڑے برسوں میں تصنیف ہوئے ـــــ "ایڈیٹ" اور بھوت پریت (Devils یا becel)، وہ دستوئیفسکی کی گرھست زندگی کے ہمزاد بھی ہیں، اُس کے گواہ بھی اور عالمی ادب میں نئے ہنگامہ خیز فکری ناول کی آمد کا اعلان بھی۔

دستوئیفسکی کا یہ قول کم از کم اپنے بارے میں توصیح نکلا:

[کامیاب] شادی زندگی کی تین چوتھائی خوشی ہے اور اس کے علاوہ باقی خوشیاں مل کر ایک چوتھائی ......"

باقی کے دس سال

۸۱ ـــــ ۱۸۷۱ء

پردیس میں چوتھے سال جب دستوئیفسکی نے ناولٹ "سدا سہاگی" مکمل کیا تو پبلشر تک ڈاک سے بھیجنے کے لئے پیسے پورے نہیں پڑے۔ روس سے پیشگی رقم آئی تو مسودہ بھیجا گیا۔ مگر مصنف کو اب رقم کی فکر نہیں تھی۔ یوروپ کے سیاسی سماجی خلفشار سے جو تجربے نچوڑے تھے اور خود روسی زندگی میں ہلچل کے جو آثار نظر آرہے تھے ان پر اپنی فکر و نظر کا حاصل کاغذ کے سپرد کرنے کے لئے بے قرار تھا۔

.... اٹھارہ مہینے ہونے کو آئے، کچھ نہیں لکھا۔ ("سدا سہاگی" کو میں شمار نہیں کرتا) لکھنے سے تھکتا اور اکتا جاتا ہوں ..... البتہ وہ جو میں نے سویرا (زریا") رسالے سے وعدہ کر رکھا ہے، وہ عمدہ ہے اسے اچھی طرح کرنا چاہتا ہوں۔ دو سال سے میرے دماغ میں پک رہا ہے .... یہ میرا آخری ناول ہوگا۔ (خطوط)

یہ ناول وہ پانچ حصوں میں لکھنا چاہتا تھا "بڑے گنہگار کی سرگزشت" کے عنوان سے۔ اس کے حصے بکھرے تین جدا گانہ ناولوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

... جو خیال سوچا ہے اس میں وہ سب کچھ سما گیا ہے جس کے لئے اب تک جیا ہوں۔ مگر اس ناول کو لکھنے کے لئے روس واپس آنا لازم ہے ..... اصل سوال جو اس تصنیف میں پھیلا ہوا ہوگا، وہی ہے جو دانستہ یا نادانستہ مجھے عمر بھر کچوکے دیتا رہا ـــ وجود باری تعالیٰ۔ میرے ناول کا ہیرو یکے بعد دیگرے [کئی دور عمل سے گزرتا ہوا] اوّل لا مذہب ہے، پھر صاحب ایمان، پھر مذہبی، جنونی، پھر بدعتی، اور پھر آخر میں لا مذہب .... (۱۹ ـ ۲۶)

اس درمیان میں آننا سنیت کن کا بھائی چھٹیوں میں بہن سے ملنے ڈریسڈن آگیا۔ اس نے ماسکو یونیورسٹی میں طلبا کی سیاسی شورشوں اور خفیہ سازشوں کے قصے سنائے۔ ایک ہم عمر طالب علم ایوانوف کا بڑے جوش سے ذکر کیا کہ بڑا تیز اور ذہین ہے۔ پہلے کسی خفیہ گروہ میں شریک تھا، اب نکل آیا۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ ایوانوف کو اس کے پرانے ساتھیوں نے [انقلابی کاز سے دغا کرنے کے جرم میں] بہانے سے لے جا کر قتل کر دیا اور لاش نزدیک کے تالاب میں ملی۔ سازشیوں کا سرغنہ نیچائیف نام کا شخص تھا، روسی انارکسٹ باکونین کا ماننے والا۔ لاش ملتے ہی وہ روس سے فرار کر گیا۔ دستوئیفسکی، کہ خود ان گروہوں سے باخبر اور بدظن رہ چکا تھا۔ سنتے ہی تلملا گیا۔ طے کیا کہ

اوّل اسی مسئلے سے نبٹ لیا جائے۔

۲۰ اپریل (۱۸۷۰ء) کو مائیکوف کے نام ایک ذاتی خط میں لکھتا ہے:

.... میں اب جو لکھ رہا ہوں، بڑے کانٹے کی چیز ہے، پوری طاقت سے کہہ ڈالوں گا۔ (یہی ہے جس پر ہمارے یہاں کے منکر، نراجی اور مغرب زدہ لوگ چیخ پکار مچائیں گے کہ میں رجعت پرست ہوں) بھاڑ میں جائیں، وہ جہنم میں جائیں۔ مجھے جو کہنا ہے وہی کہوں گا، آخری لفظ تک ....

دوسرے خط میں جو ۳۰ اکتوبر (۱۸۷۰ء کو) کتکوف کے نام لکھا گیا:

میری کہانی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہوگا آیوانوف کا قتل نشچائیف کے ہاتھوں۔ اِن دونوں کے بارے میں یا واردات کی تفصیلوں کی بابت مجھے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم جو اخباروں میں چھپا ہے۔ معلوم بھی ہوتا تو جوں کا توں نقل نہ کرتا ..... میرا تخیّل اصل واردات سے بالکل مختلف رُخ اختیار کرسکتا ہے ....

اور پھر دسمبر میں سال کے آخری خط میں:

..... آج کے نوجوان کو اپنے خیالات سے اِدھر اُدھر کی باتیں بتائے بغیر پوری طرح آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ .....

یوں ناول 'بھوت پریت' ("بے سی") جنونی دورے میں لکھا گیا، خوب سوچ سمجھ کر کہ اس کے سبب روس کے ترقی پسند سیاسی سماجی حلقوں میں ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔

.... ہائے کاش اس ناول کو چین سے لکھنے کے لئے دو تین سال کا سکون میسّر ہوتا، جیسا تورگنیف، گنچروف یا تالستائی کو نصیب ہے۔ مجھے ایسی چیز لکھنی ہے جو سَو سال تک زیرِ بحث رہے ....

اِدھر جنگ فرانس و جرمن چھِڑ گئی[1]۔ دستوئیفسکی، جرمنوں کی جنگ جوئی اور ضابطہ پسندی سے یوں بھی نفور تھا، پیرس کے انقلابیوں اور کشت و خون سے اور بھی چڑ گیا۔

---

(۱) اس جنگ کے آغاز و انجام پر، خصوصًا انجام پر اور پیرس کمیون پر جہاں انقلابی نظریات کے محنت کشوں نے انسانی مساوات کی بنیاد پر شہر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، کارل مارکس کا تاریخی مقالہ برومیئر آف لوئی بوناپارٹ (؟) اور اٹھارویں برومیئر مطالعے کے قابل ہے۔ ظا

.... مغرب نے مسیح کو گم کر دیا کیتھولک عقیدہ بھی ذمہ دار ہے اس کا یہی وجہ ہے کہ مغرب موت کے غار میں اُترتا جا رہا ہے ....

سوتیلے بیٹے کو، جو وکیل دیوانی کی ٹریننگ لے رہا تھا، لکھا کہ پبلشر سے بات کرو اور پبلشر استیلوفسکی سے کہہ سُن کر کچھ رقم بھجواؤ تاکہ ہم پردیس میں سڑنے کے بجائے گھر واپس آئیں۔ تدبیر ناکام ہوئی۔ آخر اپنے ہمدرد مائیکوف سے کہہ کر سرکاری ادبی فنڈ سے قرضہ مانگنے کی درخواست دلوائی۔ صرف ڈیڑھ سو روبل قرضے کی اپیل تھی۔ رائگاں گئی؛

"..... ہاں کوئی نراجی (Nihilist) مانگتا تو اسے یہ کورا جواب نہ ملتا ....."

کسی اخبار میں اشتہار نظر سے گزرا کہ ناول "جرم و سزا" کا نیا اڈیشن چھپنے والا ہے۔ دستوئیفسکی کے پاس پبلشر سے کیا ہوا معاہدہ موجود تھا۔ اسے اُلٹا پلٹا اور خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ یا تو پبلشر استیلوفسکی سیدھی طرح ایک ہزار روبل رائلٹی ادا کرے ورنہ مقدمہ دائر کر دیا جائے۔

وکیل کے ذریعے مقدمہ دائر ہوا۔ درد کا درماں نہ ملا۔ معاہدے کی شرطوں میں مزید حقِ تصنیف کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

آخر اسی پُرانے رفیق کشکوف نے جیسے تیسے کچھ روپیہ بھیجا سفر خرچ کے طور پر اور یوں ۸ جولائی گزار کر وہ نیم جان وطن واپس آیا۔

مائی ڈیر سونچکا۔ ناراض نہ ہونا کہ اتنے دنوں سے تمہیں خط نہ لکھا۔ اُمید تھی کہ عنقریب ہم ملنے والے ہیں۔ ڈریسڈن میں میری حالت اتنی وحشت ناک تھی، روپیہ کا اتنا سخت انتظار تھا کہ میں اپنا کام نہیں کر سکا۔ زندگی جینے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔

۸ جولائی کو ہم ڈریسڈن سے روانہ ہوئے، نویں تاریخ کو اکسپریس ترین سے سینٹ پیٹرسبورگ پہنچے۔ بیوی حمل کے آخری ایام میں ہے اور بچی لیوبا، بغیر آیا کے میری گود میں تھی۔ دونوں دو رات نہ کہیں ٹھہرے، نہ سو سکے۔ سینٹ پیٹرسبورگ میں اُترتے ہی ہمیں کہیں ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ ایک بڑا سا کاٹھ گودام ملا۔ بڑا ہنگامہ پُر شور اور اوپر سے یہ کہ بدمزاج یہودی مالک مکان۔ پھر عزیزوں اور دوستوں نے ہم سے ملنے کے لئے تانتا باندھ دیا۔ نیند تک پوری کرنا ممکن نہیں رہا۔

اچانک ۱۵رجولائی کی رات میں [میری بیوی] آنناکو درد زہ اُٹھنا شروع ہوا۔ جمعہ کے دن صبح سویرے چھ بجے خدا نے ہمیں ایک بیٹا دیا، دیعہ فی الحال کپڑوں لتّوں میں لپیٹا جارہا ہے اور اپنے تندرست پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ پکار مچائے ہوئے ہے (چنانچہ نہ میں کام کرسکا، نہ ماسکو جاسکا۔ حالاں کہ کتکوف سے مل کر بات کرنا بہت ضروری ہے)۔ اب میں کام کرنے بیٹھا ہوں اور سر گھوم رہا ہے۔ یقین ہے کہ پھر دورہ پڑے گا۔ تھک کر چور ہوچکا ہوں ..... بس چند سطریں تمہیں لکھ دیں۔ اس سے زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ ہر طرف گڑبڑ ہے۔ نوکر رکھا تھا، بُرا نکلا۔ میں خود ہی بھاگ دوڑ کے کام کر رہا ہوں۔ ذرا سوچو، میرا کیا حال ہوگا۔ (۱۹۶-۱۲۶)

دستوئیفسکی کے ایک معتبر سوانح نگار دولی نن (Dolinin) نے لکھا ہے کہ سُسلووا سے منھ موڑ کر آنناکو اپنانے میں اس نثر نگار نے شاعری کے بدلے نثر لے لی۔

زندگی کی یہ نثر اب چار سال بعد اپنے گھر واپس آئی ہے۔ ساٹھ روبل کے قریب رقم، مسودات کے دو تین ٹرنک کل یہی اثاثہ پاس ہے (دونوں میاں بیوی نے روانگی سے پہلے بہت سارے تراشے اور کاغذات اس ڈر سے جلا دیے تھے کہ سرحد پر سخت تلاشی ہوگی ــــ اور وہ ہوئی بھی) آتے ہی دیکھا کہ گھر کا سروسامان کتابوں سمیت غت ربود ہو چکا ۔ صرف قرض خواہوں کی ڈگریاں اور واجب الادا ہنڈیاں باقی تھیں۔ شوہر کو بے دخل کر کے دو شیر خوار بچوں کی ماں آننا نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے؛ کرائے کا مکان اور ضروری فرنیچر حاصل کیا، سلیقے سے اُٹھنے بیٹھنے کا اہتمام کیا اور تقاضا کرنے والوں سے جو مکھی لڑنے کو تیار ہوگئی۔ روکھے پن سے جتا یا کہ قانوناً اگر نادہند قرض دار کو بطور سزا جیل جانا پڑا تو قید و بند کے زمانے کا خرچ قرض خواہوں سے وصولا جائے گا؛ مکان اور فرنیچر کرائے کا ہے، رائلٹی بیوی کے نام۔ مقدمہ بازی سے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔ البتہ اگر خاموشی اور صبر سے کام لیں تو نمبر وار ایک ایک کا قرض قسطوں میں ادا ہوگا۔ سب نے ہار مان لی۔ بُرا وقت ٹل گیا۔

دستوئیفسکی کو رنج ضرور ہوا تاہم اجازت دے دی اور آننا نے عارضی طور پر اسٹینوگرافی کی ملازمت کرلی۔ شوہر کو ماسکو بھیجا تاکہ پُرانے تعلقات اور نئے اگریمنٹ پکے کرے۔

یہیں دستوئیفسکی کی ملاقات چند ہم خیال اور بااثر لوگوں سے ہوئی۔ فن کے قدرداں اور صاحبِ ذوق

جاگیردار تریتیاکوف نے مصنف کو بلا بھیجا۔ دعوت کی اور چاہا کہ وقت کے مشہور مصور پیروف سے وہ ایک یادگار پورٹریٹ بنوانے پر راضی ہو جائے (۱) تصویر کا کچا خاکہ کئی دن تیار ہوتا رہا۔ ایک پرنسس نے ناول "جرم و سزا" کو ڈرامائی شکل دینے کی درخواست کی۔ بڑے بڑے دیوان خانوں میں اعزازی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ اخباروں نے اعلان چھاپے۔ ہماہمی میں مصنف بھول گیا کہ وہ خاص کس کام سے ماسکو آیا تھا۔ لیکن اس شہرت سے فیض بھی پہنچا۔

جرنلزم اور ادب

رسالہ "نقیب روس" میں "بھوت پریت" کی سلسلہ وار اشاعت نے جو ہنگامہ برپا کیا، اسی لپیٹ میں حکومت وقت کے منظور نظر امیر مشیرسکی سے ان کے گھر بدھ کی مستقل دعوت میں ملاقات ہوئی۔ وہیں سینیٹ (رسی نوڈ) کا ممبر ماہر قانون بینیدانو تستسف ملا۔ دونوں سے دستوئیفسکی کا ہم خیالی کا رشتہ بننے لگا۔ اور انھوں نے ایک نئی وضع کا ہفتہ وار نکالنے کی داغ بیل ڈالی "گراژدانین" (شہری)۔ فاقہ مست ناول نگار کو اس کی اڈیٹری تجویز ہوئی۔ ڈھائی سو روبل ماہانہ تنخواہ، مزید جو کچھ وہ اس میں بحیثیت مصنف لکھے، اس کی ادائگی، کاپک فی سطر الگ سے۔ چناں چہ اُدھر "بھوت پریت" کی آخری (تیسری) قسط رسالے میں نکلی، اُدھر دستوئیفسکی نے "گراژدانین" میں "ادیب کا روزنامچہ" لکھا، جو اپنے قسم کی پہلی تحریر تھی۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ جنوری ۳، ۱۸۰ء کی پہلی تاریخ کو نکلا، ٹھیک اُس وقت جب ناول پر لے دے ہو رہی تھی اور وہ ادبی سماجی دنیا میں بحث کا مستقل موضوع بنا ہوا تھا۔

آننا نے طے کیا کہ قاتل نشچایئف کی گرفتاری، اقبال جرم، سازش کی تفصیلات اور ناول پر بحثا بحثی نے بیک وقت ایسے حالات مہیا کر دیے ہیں کہ نادان مصنف کو پبلشروں کے پنجے سے چھٹکارا دلایا جا سکتا ہے۔ ناول کو خود کتابی شکل میں چھاپنے کا اعلان کر دیا۔ قرض اُدھار کر کے پہلا اڈیشن ساڑھے تین ہزار کا ہاتھوں ہاتھ نکال دیا۔ پہلے ہی دن جب دستوئیفسکی سو کر اُٹھا تو اُسے بیوی نے بتایا کہ آج کے آج ایک سو پندرہ کاپی بک چکی ہے۔ شام کو ایک اور بکسیلر . . ۳

---

(۱) تریتیاکوف کو ۱۹ ویں صدی کے روس میں وہی رتبہ حاصل ہے جو ہمارے ہاں سرسالار جنگ کو، کہ محض ذاتی ذوق اور کاوش سے فن کے بیش بہا خزانے جمع کئے۔ دونوں کی چھوڑی ہوئی آرٹ گیلریاں دنیا جہان کے لئے زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں۔ پیروف کی بنائی ہوئی یہی تصویر (۲، ۱۸۰ء) آج بھی تریتیاکوف گیلری میں لگی ہے اور وہی ہم نے اس کتاب میں شامل کی ہے۔

کاپی خرید لے گیا۔ آننا سودا پٹانے میں کامیاب رہی۔ جو رقم ہاتھ آئی اس کو سب سے پہلے، شہر سے دور الپین جھیل کے کنارے "استاریا رسا" میں ایک پُرسکون بنگلہ خریدنے پر صَرف کیا۔

۲۳ جون ۱۸۶۷ء

..... فیدیا (لڑکا) مجھ پر فدا ہے۔ جیسے ہی اندر قدم رکھتا ہوں، بُری طرح ہمکنے، پکارنے اور اُچھلنے کودنے لگتا ہے کہ کسی طرح میں اُسے گود میں اُٹھا لوں۔ میں جانوں، یہ بچّہ اچھے ہاتھ پاؤں کا اور جاندار نکلے گا۔ آیا اسے بہلانے کے لئے سارے جتن کرتی ہے۔ مجھے اس بے چاری کی پریشانی پر بعض اوقات بڑا رحم آتا ہے۔ بچّوں کو زندگی اور دُھوپ چاہیے۔ انھیں ہاتھ پاؤں نکالنے ہیں۔ مگر دھوپ کہاں۔ دھوپ نہیں ملتی۔ ننھی بچّی لیسکیا شہر کے غبار آلود شامیانے تلے پھنسی ہوئی ہے اور ہم یہاں کیچڑ مٹی میں ..... جب کوئی گھوڑا گزرنے لگتا ہے، میں لڑکے کو کھڑکی ہی سے دکھاتا [اور بہلا دیتا] ہوں۔ اسے بڑا مزہ آتا ہے۔ گھوڑے اور ٹھیکاری سے لطف لیتا ہے..... میں تو اس زندگی سے تنگ آگیا۔ تحریر کا کام اچھا ہے اگر آسانی سے چلتا رہے۔ مگر یہاں میرا قلم اٹک اٹک کر بڑھتا ہے۔ اور سچ کہوں تو لکھنے میں دل ہی نہیں۔ پڑھنے کے لئے بھی کچھ نہیں ملتا ....

اگرچہ عیش و آسائش کا کوئی سامان نہیں کرتا، بلکہ میں تو [آج کل] کوڑی کوڑی کا حساب بھی رکھتا ہوں، پھر بھی روپیہ اُڑ جاتا ہے۔ ہفتہ بھر میں تین روبل اُٹھ گئے .....

روپے پیسے کی تکلیف کے یہ آخری دن تھے۔ پھر تو دھن برسنے لگا۔ نئے کپڑے سلے۔ کئی کئی جوڑی جوتے خریدے گئے۔ خدا جانے دستوئیفسکی کا ذوقِ خوش پوشی اب تک کہاں سویا ہوا تھا کہ ایک دم جاگ اُٹھا۔ اور باقی عمر میں کبھی کسی نے اس کے لباس پر انگشت نمائی نہیں کی۔

البتہ جمہوریت پسند حلقوں نے "بھوت پریت" کی اشاعت پر اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک رسالے "کرن" نے ذاتی حملوں سے دامن بچا کر تنقید بھی کی تو یوں:

اگر آپ کی قوتِ برداشت اس مصنف کے ناول کو آخر تک پڑھنے میں ساتھ دے جائے جو کسی وقت بڑے پایہ پر رہ چکا ہے تو غصے کے علاوہ آپ کو ترس بھی آئے گا، بلکہ افسوس ہو گا

ایک لائق مصنف کا گرنا تو کیا، ایک انسان کی گراوٹ کو دیکھ کر آپ کو رنج ہوگا.......

اس کے زندگی بھر کے ہمدرد صاحب قلم استراخف نے نکتہ چینی کے ساتھ ہمدردی بھرا خط لکھا:

"....خیالات سے مالا مال ہونے میں، رنگا رنگی میں آپ قطعی طور پر روس کے ادیب نمبر ایک ہیں۔ تالستائی بھی آپ کے مقابلے میں بے لطف یکسانی کا شکار نظر آتا ہے.....مگر آپ اپنی تصانیف کو الجھا بہت دیتے ہیں۔ اگر آپ کے ناولوں کا تانا بانا سادہ ہوتا تو ان کا اثر بھی بردست پڑتا۔ "جواری"، اور "سدا سہاگی"، دونوں نے گہرا اثر چھوڑا لیکن "ایڈیٹ" میں جو خیالات بھر دیے ہیں وہ پڑھنے والوں کے پلّے نہیں پڑے.... آپ کی سی ذہانت اور قابلیت کے ایک بٹا دس سے کام لے کر کوئی فرانسیسی یا ہوشیار جرمن دونوں میدانوں میں شہرت کے جھنڈے گاڑ دیتا اور عالمی ادب کی تاریخ میں اوّلیں درخشاں ستارے کی طرح جگمگایا کرتا۔" (۳۶۱-۵)

دستوئیفسکی نے منہ تو بنایا، دوستوں سے شکایت بھی کی لیکن کڑوی گولی گلے اتار لی:

"....واقعی میں کئی ناولوں کو ایک میں کھپا دیتا ہوں، نتیجہ یہ کہ ربط اور باہمی تناسب میں فرق پڑ جاتا ہے۔ وجدان (انسپریشن) کی قوت اظہار کے ذریعوں سے ہمیشہ کہیں شدید ہوتی ہے....."

اسے یہ دکھ بھی تھا کہ پبلشر کتکوف نے "استاوروگن کے اعترافات" والا باب ناول میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ اس میں کم سن لڑکی سے زنا بالجبر کا بیان فحش تھا اور سنسر بہر حال منظور نہ کرتا۔ برسوں یہ باب شریک اشاعت نہ ہو سکا۔

مصنف کے علاوہ اڈیٹر اور نظریہ ساز ہونے کی حیثیت سے بھی دستوئیفسکی کا میل جول سوسائٹی کے اوپر کے حلقوں سے جو پہلے اس کے روادار نہیں تھے، بڑھتا چلا گیا۔ رسالے "گراژدانین" کے رئیس اور تنک مزاج مالک بظاہر خوش تھے، مگر یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ان کے اختیارات میں فرق آئے اور اڈیٹر کا فیصلہ آخری قرار پائے۔ پرنس مِشیرسکی نے دخل دینا شروع کیا اور دستوئیفسکی نے اپنے زعم میں اونچی کمند پھینکی۔ ولی عہد سلطنت کو بہت چاپلوسانہ خط لکھ ڈالا اپنے خیالات اور کارنامے پر۔

ولی عہد سلطنت کے نام جو بعد میں شہنشاہ الیکساندر سوم ہوا، اس خط میں دستوئیفسکی نے مغرب زدہ حلقوں اور سماجی ترقی کے جمہوری حامیوں سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے اپنی تازہ تصنیف "بھوت پریت" بطور نمونہ بھیجی ہے اور اشارۃً شاہی سرپرستی چاہی ہے۔

خلاصہ اس خط کا یوں ہوگا کہ

نشچآئیف کے سے سازشی گروہ اور سیاسی قتل کے واقعات اس لئے پیش آتے ہیں کہ تعلیم یافتہ روس اور عام دیسی جنتا کے درمیان ایک گہری خلیج ہے۔ جو۔ لوگ ترقی کے یوروپ نواز خیالوں میں غرق ہیں، اپنی تمام ذہانت اور دانائی کے ساتھ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دیسی کلچر جیسی کوئی چیز وجود ہی نہیں رکھتی۔ ان کے خیال میں خود کو یوروپی کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ روسی ہونے سے ہاتھ دھو لیے۔ سائنسی اور ذہنی ترقی میں چوں کہ ہم باقی یوروپ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اس بدحواسی میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ...... اگر ہم اپنی لائنوں پر آگے بڑھیں، دیسی طریقے سے ترقی کریں تو بحیثیت روسی ہمارے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ تمام دنیا کو روشنی دکھائیں ...... تاریخ کا اٹل فیصلہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دنیا کے سامنے ایک قوم کی حیثیت سے خاص اپنی اہمیت پر جب تک سینہ زوری کے ساتھ یقین نہ ہوگا، تب تک نہ ہم ایک بڑی قوم بن پائیں گے، نہ عالم انسانیت کو، معمولی سہی اپنی طرف سے کوئی اچھوتا تحفہ دے پائیں گے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ جتنی بڑی قومیں اب تک اٹھی ہیں انھوں نے اپنی قوت وعظمت کا اظہار اسی سینہ زوری میں کیا ہے، اسی خودفریبی میں [کہ وہ بڑی قوت ہیں] دنیا کو ان سے کچھ فیض پہنچا ..... مطلب یہ کہ ہمیشہ بڑے فخر کے ساتھ، دوٹوک طریقے سے اور سینہ زوری کے ساتھ اپنے ہی بل بوتے پر اٹھنا اور اپنے دم کا بھروسا رکھنا [ان کی ترقی کا] بنیادی سبب رہا ہے۔" .....

یہ تھا وہ خیال جسے روزمرہ کی مثالوں سے، اور واقعات سے، تبصروں سے دستوئیفسکی نے نئے رسالے "گراژدانین" کے ذریعے عام اخباربیں حلقوں میں عام کرنا چاہا تھا، اور اسی کی خاطر "ادیب کا روزنامچہ" شروع کیا، تاکہ رسالے کی سرکاری پالیسی سے آزاد ہو کر لکھ سکے۔ وہ نہ تو مالکوں کی مصلحتوں میں خود کو جذب کرنا چاہتا تھا، نہ صحافت کے تقاضوں پر ادب کو قربان کرنا۔

ایک دوست بگو دین کے نام ۲۶ فروری ۱۸۷۳ء کا پورا خط، جو مفکر، ادیب، ایڈیٹر، گرہست اور سماجی پرچارک کی اندرونی کشمکش پر روشنی ڈالنے والا ہے، یہاں دینا چاہیے؛ ہم اس کے صرف اقتباس سے کام لیں گے:

... مضامین [اور خبر نامے] جو رسالے کے لئے آتے ہیں، ان سب کو پڑھنے میں وقت کا بہت سا حصّہ کھپ جاتا ہے اور تندرستی بگڑتی ہے۔ کیوں کہ میرے خیال میں در اصل یہی اصل کام کا وقت ہے جو یوں نکل جاتا ہے۔ جب کسی مضمون کو چھاپنے کے لئے چنتا ہوں تو اکثر خود ہی اوّل سے آخر تک اس پر قلم چلانا پڑتا ہے ... .

بڑی مصیبت یہ ہے کہ بے شمار چیزیں ہیں جن پر مجھے خود لکھنا ہے .... بہت کچھ خود بھی کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسی کی خاطر یہ اخبار کا کام اپنے ذمّے لیا بھی ہے ..... سوشلزم نے قریب قریب ساری نسل کی جڑیں کھود ڈالی ہیں .... ہمیں اس سے لڑنا ہے کیوں کہ ہر شے میں اس کا اثر سرایت کر گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوشلزم اصل میں مسیحیت کا نقیض (برعکس) ہے۔ مضامین کا پورا سلسلہ لکھ کر یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں ..... دل و دماغ میں ناول اور کہانیوں کی اُتھل پتھل ہے۔ ان کے کچّے خاکے بناتا ہوں، تفصیلات درج کرتا ہوں، پھر پتہ چلتا ہے کہ سارا وقت رسالے میں کھپ گیا ......

بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ "گراژدانین" کی ذمہ داری لے کر سخت حماقت کی۔ پھنس گیا ہوں۔ اب یہی دیکھیے کہ بیوی بچوں سے جدا نہیں رہ سکتا۔ گرمیاں آتے ہی انھیں شہر سے دور، اپنی صحت کی خاطر سینٹ پیٹرسبورگ سے جہاں تک ممکن ہو دور، بہت دور جاکر رہنا چاہیے۔ گر مجھے تو اِس پیپر کی خاطر یہیں ٹھیرنا پڑے گا۔ مطلب ہے اہل و عیال سے جُدا رہنا۔ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے ....

ابھی وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ غنائی شاعر، دستوئیفسکی کے پسندیدہ اور مقبول شاعر تیوتچیف

(Tyuechav) کا انتقال ہوگیا۔ اڈیٹر نے پورے شمارے کو پھر سے پلان کیا، تاکہ شایانِ شان ماتمی مضمون اور سوانحی خاکہ دیا جاسکے۔ پرچہ پریس کو جانے والا تھا کہ پرنس مِتیشرسکی نے اپنا قلم برداشتہ غلط سلط مضمون چھپنے بھیج دیا۔ اس پر اڈیٹر کو حسب معمول "اوّل سے آخر تک قلم چلانا" پڑتا اور نہ وقت میں گنجائش تھی، نہ رسالے کے ورقوں میں۔ اڈیٹر بھڑک اُٹھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔

ذمہ دار اڈیٹری کا دو سال کا معاہدہ، جس سے مصنّف کو تقریباً تین سو روبل ماہانہ مل جاتے تھے، ایک سال پورا کرچکا تھا کہ دستوئیفسکی اس رسالے میں اپنا آخری مضمون اور استعفا دے کر اُٹھ گیا۔

"ادیب کا روزنامچہ" البتّہ خاصے کی چیز بن گیا۔ ابتدا اخبار کے لئے ہوئی تھی، ہفتہ وار سے ماہانہ ہوا، پھر اُکھڑنے لگا۔ بعد میں مصنّف کی منیجر بیوی نے اسے کتابی شکل میں چھاپا۔ پھر اسی نام سے آگے چل کر دستوئیفسکی نے (۷۷-۷۶، ۱۸۷۶ء) ماہ نامہ نکالا۔ اگست ۱۸۸۰ء اور جنوری ۱۸۸۱ء میں اس کا صرف ایک ایک شمارہ نکلا۔ کُل شماروں کے چھپے ہوئے مضامین سے دو جلد کتاب بنی، جس کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے بھی ہوگئے اور آج تک، مصنّف کے زمانے، ذہن اور شب و روز کو سمجھنے میں اِن جلدوں کی اہمیّت برقرار ہے۔ اخباروں میں اور نظر سے گزرنے والا کون سا موضوع ہے، کون سا ایسا سماجی یا سیاسی واقعہ ہے جس پر مصنّف نے مکمل کر بحث نہ کی ہو۔ اور یہ بحث مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں کارگر بھی ثابت ہوتی تھی۔

رسالے سے اٹھا تو ایک روز پُرانے بچھڑے ہوئے، بلکہ بگڑے ہوئے ہمسر اور ہم عصر شاعر نکراسوف نے اچانک دروازے کی گھنٹی بجائی۔ نکراسوف اُن دنوں پنائیف کی شرکت سے ایک معیاری رسالہ "آتے چیست وین نی یے زاپیسکی" (وطن کی تحریریں) اڈیٹ کرتا تھا اور اس رسالے سے دستوئیفسکی کے ہم خیال حلقے کی دشمنی تھی۔ نکراسوف کا ان حالات میں دستوئیفسکی کے گھر آنا کوئی معمولی جرأت کا کام نہیں تھا۔ یہ وہی نکراسوف تھا جس نے دستوئیفسکی کو اس کی نوعمری میں پہلی قلمی کاوش "بچارے لوگ" پر آدھی رات گئے آکر مبارک باد دی تھی اور پائے تخت کے عالمی ادبی حلقوں میں ڈھنڈورا پیٹ دیا تھا۔ وہی نکراسوف، جس سے خیالات اور عادات کے اختلاف کی بنا پر اتنی بگڑ چکی تھی کہ دس سال سے ایک نے دوسرے کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ اب وہی خوش باش، خوش فکر مقبولِ عام شاعر دروازے سے مطالعے کے کمرے میں مُسکراتا ہوا داخل ہوا۔ آگے کی کہانی آننا سنیت کِن کی زبانی سُننے کے قابل ہے۔

..... مجھے ایسی کُرید لگی کہ ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ مطالعے کے کمرے سے جو دروازہ کھانے کے کمرے میں نکلتا تھا، اسی دروازے کی آڑ میں چھپ گئی [کہ دیکھوں کیا باتیں ہوتی ہیں] ..... وہ میرے شوہر کو اگلے سال اپنے رسالے ..... کے لیے ناول لکھنے کی پیش کش کرنے لگے اور اب تک جہاں ڈیڑھ سو روبل فی جزو (ڈیمی سائز کے سولہ صہفے) ملا کرتا تھا، انھیں ڈھائی سو روبل آفر کیے۔

نکراسوف نے، ہمارے معمولی سے کم خرچ رہن سہن کو دیکھ کر غالبًا سوچا ہوگا کہ فیودر (دستوئیفسکی) اس ریٹ پر خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا اور فورًا حامی بھر لے گا۔ لیکن فیودر نے آہستہ سے شکریہ ادا کیا اور جواب دیا: "دو وجہوں سے میں قطعی جواب فی الحال نہیں دے سکتا۔ اول تو یہ کہ "نقیب روس" رسالے کے لیے لکھنا ہے۔ ان سے معلوم کروں گا کہ میرا ناول درکار ہے یا نہیں۔ اگلے سال کا مال مسالہ ان کے پاس ہوا تو پھر میرے ہاتھ کھلے ہیں۔ آپ سے نئے ناول کا وعدہ رہا..... [اس رسالے کے اڈیٹر پبلشر] کتکوف نے ہمیشہ میرے ساتھ ہمدردی کی، وقت پر میرے کام آیا۔ یہ بات شرافت سے بعید ہے کہ اسے اپنی نئی تصنیف پیش کیے بغیر چھوڑ دوں۔ دو تین ہفتے میں اس سے معلوم ہو جائے گا۔ ہاں ایک بات جتا دوں آپ کو کہ جب بھی میں نے لکھا پیشگی رقم لے کر لکھا۔ دو سے تین ہزار روبل تک مجھے اپڈوانس مل جاتا ہے۔

نکراسوف اس پر بھی راضی ہو گئے۔

فیودر نے کہا، دوسری بات یہ ہے، کہ مجھے اپنی بیوی کی رائے معلوم کرنی ہے۔ گھر پر ہیں۔ ابھی پوچھ لیتا ہوں" جیسے ہی وہ آئے، میں نے کہا "پوچھنے کی کون سی بات ہے۔ فورًا ہاں کر لو۔ فیدیا پیارے، منظور کر لو۔

"کیا منظور کر لو؟" وہ آنکھیں پھاڑ کے مجھے تکنے لگے۔

"توبہ ہے الٰہی۔ ارے یہی، نکراسوف کی پیش کش اور کیا؟"

"مگر تمھیں کیسے معلوم، کیا پیش کش ہے؟

"مجھے سب معلوم ہے، دروازے کی آڑ سے سُن چکی ہوں"

"اچھا تو چپکے چپکے کان لگائے سُن رہی تھیں؟ شرم نہیں آتی تمھیں آنا؟ فیودر نے منہ بنا کر افسوس سے کہا۔ ....

باہر جا کر فیودر نے بتا دیا کہ میں نے اندر بات کر لی۔ آنا کو بڑی خوشی ہے کہ میرا ناول آپ کے پرچے میں چھپے۔ نکراسوف کو بُرا لگا کہ ایسے معاملے میں فیودر کو بیوی سے مشورے کی ضرورت پیش آئی۔ وہ بولے:

"مجھے گمان بھی نہ تھا کہ آپ ایسے زن مُرید نکلیں گے"

(۴-۲۴۲)

دستوئیفسکی ماسکو گیا۔ کتکوف سے پوچھا۔ پتہ چلا کہ اس نے تالستائی کا تازہ ناول "آنا کرے نینا"

اشاعت کے لئے خرید لیا ہے۔ کتکوف نے تالستائی کو پانچ سو روبل فی جزو معاوضہ پیش کیا تھا۔ دستوئیفسکی کو جب معاوضہ کی بھنک ملی، اس کے کان کھڑے ہو گئے اور کتکوف کی طرف سے دل کھٹا ہو گیا)

نئے ناول پر کام شروع کرتے وقت مصنف کی صحت تباہ تھی۔ طے پایا کہ وہ جرمنی کے قدرتی چشموں پر ہو آئے۔ جہاں چھ ہفتے کے لئے EMS کے صحت افزا مقام پر پہنچا۔ یوروپ میں فوجی طاقت بڑھاتا ہوا اور سلطنت سازی کے نشے میں اِتراتا ہوا جرمنی اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ جوئے کی میز اور پولینا کے غمزے دونوں کی لت چھوٹ چکی یا چھڑائی جا چکی تھی، اب ایک فکر تھی کم وقت کے زیادہ مصرف کی۔ ۱۸۷۹ء تک وہ چار بار پھر EMS بھیجا گیا۔ ایک بار بیوی نے اوپر سے بھی رقم بھیجی کہ پیرس ہوتے آنا، کچھ خریداری کرتے لانا، مگر وہ نہ گیا اور روس واپس آتے ہی شہر سے تو میل اور ریلوے اسٹیشن سے دور ۱۵ روبل مہینے کرائے کے اور پھر ذاتی خرید کے بنگلے میں نیا ناول لکھنے بیٹھ گیا۔

نیا ناول "پدر روستک" (نونہال) لکھا جا رہا تھا اور آننا عارضی نوکری چھوڑ کر اب شوہر کے اشاعتی معاملات پھیلانے میں لگ گئی تھی۔ ۱۸۷۵ء کو پورے سال اِدھر مسودہ تیار ہوتا، اِدھر 'وطنی تحریریں' رسالے میں قسط نکل آتی۔ یوں یہ ناول پورا ہوا جسے بعض ناقدوں نے اس کے شاہکاروں میں شمار کیا ہے اور بعضوں نے ڈھیلے ڈھالے پلاٹ کا ایک کمزور ڈھانچہ، لیکن اس کے سوانحی کردار کو سب نے مانا ہے۔ دستوئیفسکی بھی اس کے بارے میں کچھ پُر اُمید نہیں تھا۔

۱۸۷۵ء میں جب مصنف پر پھر ایک بار جی جان سے لکھنے کا جنون سوار ہوا، تو مرگی کے دورے بھی بار بار پڑنے لگے۔ اگست ۱۸۷۵ء میں تیسری بار بچہ ہوا، جسے الیکسئی (الیوشا) نام دیا گیا۔ گھر کا خرچ بڑھ گیا۔

ترکے اور ناگواریاں

سوتیلا بیٹا پاویل جو نکھٹو پن کا اور ساتھ ساتھ دستوئیفسکی سے جیب خرچ وصول کرنے کا عادی ہو چکا تھا، اب گھر بار سنبھالے بیٹھا تھا۔ خرچ بڑھانے کے ساتھ اُس نے گھر کی مالکن، آننا سے جھگڑے بھی بڑھا لئے تھے۔ شروع شروع تو مصنف بند مٹھی مدد کرتا رہا، آخر اُکتانے لگا۔ تالستائی کے ناول "آننا کرے نینا" کی گرمیِ بازار سے اُسے یہ اندیشہ بھی ہوا کہ شاید کتکوف پیشگی رقمیں دینے سے کترائے اور یہ تار ٹوٹ جائے۔ اِدھر مالیات پر آننا کا کنٹرول۔ آخر پاویل کے ہاتھ پسارتے رہنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

بھائی میخائیل کا جو صحیح معنوں میں دست و بازو تھا، انتقال (۱۸۶۴ء) ہو جانے کے بعد دستوئیفسکی کے بعد دو بھائی بچے تھے، دوسرا، یا سب سے چھوٹا نکولائی شروع ہی سے نکھٹو نکلا۔ بھائی کے قلم کی گاڑھی کمائی سے اُسے پچاس روبل مہینہ تو مقرر تھا ہی، اس کے علاوہ بھی ضرورۃً کچھ نہ کچھ مار لیتا تھا۔ اس کی آنکھ کا کانٹا تو تھی ہی، اس سے بھی زیادہ آننا کھٹکنے لگی دستوئیفسکی کی تینوں [شادی شدہ] بہنوں کو، جنھیں توقع تھی کہ بیوہ اور لا وارث خالہ کی بڑی جاگیر سے اور باپ کی زمین سے سب بہن بھائی کو حصہ رسدی پہنچنا چاہیے، آننا کی ہوشیاری سخت رُکاوٹ بن گئی۔ وہ خود تین زندہ بچّوں کی ماں اور ایک بیمار، بدحواس جنونی شوہر کی تیمار دار تھی۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر مقدم رہی ہوگی۔

۱۸۶۴ء میں جب دستوئیفسکی اپنا گھر بسانے کی خاطر کہیں نہ کہیں سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے بے قرار تھا، کوماٹین خالو نے انتقال فرماکر اُس کی مشکل آسان کر دی تھی کہ یک مُشت تین ہزار روبل ترکے میں مل گئے، پھر دونوں بھائیوں کو دس دس ہزار روبل رسالہ چلانے کو بیوہ خالہ نے دیے تھے، اب جو دس سال بعد وصیت نامہ مرحومہ چھوڑ گئیں اُس نے منفعت کی بڑی رقم کے ساتھ بڑی رُکاوٹیں بھی کھڑی کر دیں۔ تمام ورثہ تین حصّہ داروں میں برابر تقسیم ہونا تھا۔ نیلام پر نہ کوئی ایک خریدار کھڑا ہوتا تھا، نہ تینوں وارث اکٹھے ہو پاتے تھے۔ مقدمہ چلا اور برسوں چلتا رہا۔ آننا آخر شوہر کو ملک سے باہر بھیج کر پورا قضیہ ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ اور جب دستوئیفسکی بے خبر واپس آیا تو اسے بتایا گیا کہ جائداد کی تقسیم میں اخلاقی اصول کو بالائے طاق رکھ کر تمھاری بیوی نے قانونی ہتھکنڈوں سے اپنا فائدہ کرلیا۔ ۲۰۰ دسیاتین(۱) صحرائی اور سو دسیاتین کاشت کی زمین اب دستوئیفسکی کو بیٹھے بٹھائے مل گئی۔ بہنیں سر پکڑ کر بیٹھ رہیں اور بھابی کے سبب عزیز بھائی سے رنجش مول لے لی۔

(۱) "دسیاتین" ہم ہندوستان کی تقسیم آراضی کے حساب سے اسے "بسوہ" کہہ سکتے ہیں۔ ایک دسیاتین = ۲ء۷ ایکڑ کا

۱۹ر فروری ۱۸۷۵ء پیٹرسبورگ

"پیاری آنیا، تمھارے دونوں خط ایک ساتھ ملے، غالباً پہلا خط وہیں ڈاک خانے میں ایک دن اٹکا رہا ہوگا۔ ان سے کہو، ایسا نہ کیا کریں ورنہ خواہ مخواہ مجھے فکر لگ جاتی ہے...... روزانہ بلا ناغہ مجھے لکھتی رہا کرو، تمہاری اور بچّوں کی خیر جب تک نہ مل جائے مجھ سے ایک دن بھی رہا نہیں جاتا۔ کل ادھر تمھیں خط بند کرکے بھیجا، ادھر دروازہ کھلا اور نکراسوف داخل ہوا..... قسط اوّل کے آخری حصّے کی داد دینے آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رات بھر جاگتا اور پڑھتا رہا۔ اسی میں محو ہوگیا تھا ـــــ کہنے لگا: واہ کیا تازگی پائی ہے تم نے! ہمارے زمانے میں کسی بھی مصنف کے ہاں یہ خوبی نہیں ملتی۔ لیو تالستائی کا تازہ ناول (یعنی "آنا کرے نینا") دیکھا، جو کچھ پہلے پڑھ چکا ہوں ان کی تحریروں میں وہی یہاں بھی دُہرا دیا، بس۔ بلکہ پہلے اس سے بہتر لکھا گیا تھا، میں تو یہ کہنے آیا ہوں کہ لکھنے میں جلدی نہ کرنا۔ شروعات اعلیٰ درجے کی ہوئی ہے،، ایسے ہی چلے...... روپے کا معاملہ یہ کہ حساب میں تمہاری طرف نو سو (۹۰۰) سے کچھ کم نکلتے ہیں، اگر ایڈوانس میں ۵۰۰ اور دے دوں تو کام چل جائے گا؟

میں نے کہا پانچ سو نہیں، ہزار کردو۔ وہ خوشی سے تیار ہوگیا.....

ساری قصّے کا خلاصہ یہ کہ "وطنی تحریروں" والے اب میری انتہائی قدر کرنے لگے ہیں اور نکراسوف مجھ سے دوستانہ مراسم رکھنا چاہتا ہے......"

یہ "نونہال" ناول کی ابتدا تھی جو پورے سال پابندی کے ساتھ ترقی پسندوں کے رسالے میں چھپتا رہا اور روسی قدامت پسندوں کو دستوئیفسکی پر اس مخالف حلقے کے اثرات سے بدظن کرتا رہا۔

نکراسوف اور اس کا بااثر حلقہ اگرچہ نظریاتی مخالفین تھے، سیاسی اور مذہبی یا دشاہی کی نظر میں کھٹکتے تھے، تاہم ایک مقام تھا جہاں دستوئیفسکی اور ان کا نباہ ہو سکتا تھا (جو تورگینف اور تالستائی جیسے دانش وروں کے ساتھ ممکن نہ تھا)۔ یہ مقام تھا غریب روسی جنتا کو بیدار کرنے اور اسے اپنے قدموں پر آزادانہ تاریخی عمل کے لئے تیار کرنے کی لگن۔ حالات حاضرہ کو اس طرح عوام کے سامنے بے نقاب کرنے میں دستوئیفسکی پوری قوت کھپا دینا چاہتا تھا کہ طاقت کے اس بے پناہ سرچشمے کو موجودہ پس ماندگی اور بے حسی سے نفرت ہو جائے۔ اپنی اپنی سمتوں میں دونوں صفوں کو یقین تھا کہ مستقبل کا روس حال کے روس کو بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔

۲۱ر فروری ۱۸۷۵ء پیٹرسبورگ

..... پھر میں مائیکوف کے ہاں کھانے پر گیا...... واقعہ یوں ہے کہ آمتراخف کو میں نے اپنے خیال

کا ایک حصہ سنایا اور بتایا کہ مائیکوف ایسے روکھے پن سے پیش آیا کہ میرے اندازے سے وہ بہت ناراض تھا۔ خیر، کیا فرق پڑتا ہے۔ (دانستراخف نے غالباً یہ بات مائیکوف سے کہہ دی اسی لئے میں وہاں مدعو کیا گیا۔) دونوں میاں بیوی اور وہ سب لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔

جنگی بخار

ادھر یہ ناول قسطوں میں چھپنا تمام ہوا، ادھر دستوئیفسکی کو اپنا "ادیب کا روزنامچہ" بطور ماہ نامہ نکالنے کی سرکاری اجازت مل گئی۔ پہلے سال (۱۸۷۶) گیارہ شمارے نکلے۔ اگلے سال نو۔ زمانہ سازگار رہا۔ روس کی جنوبی سرحد پر عثمانی ترکی سلطنت کے خلاف بلقان میں جابجا بغاوت پھوٹ پڑی۔ روس اور ترکی کا محاذ یوں بھی گرم رہتا ہی تھا، اب روسی وطن پرستوں نے سرحد پار سلاف بھائیوں کی آزادی کے لئے مرنے کے لئے خوب ایجی ٹیشن پھیلایا اور ہزارہا جوانوں نے ترکی کے خلاف بلغاریہ کی شورش میں شریک ہونے کی خاطر اپنے نام لکھا دیے، روسی حکومت اعلان جنگ کیے بغیر شب خوں مارنا اور جنگی کمک دے کر اپنے حق میں جنگ کا فیصلہ کرانا چاہتی تھی۔ اسی تیاری میں کئی مہینے نکل گئے، آخر مغربی طاقتوں اور مخالفین کے دوہرے پروپیگنڈے سے تنگ آکر زار سکندر نے اپریل ۷۷ء میں اعلان جنگ کر دیا۔ اور روس کے بہترین فوجی جنرل محاذِ جنگ پر روانہ ہو گئے۔

مارچ ۷۷ء کے شمارے میں دستوئیفسکی نے اڈیٹوریل لکھا:

میں پچھلے سال جون کی ڈائری میں کہہ چکا ہوں کہ قسطنطنیہ جلد یا بدیر ہمارا ہونا چاہیے۔ وہ جوش و خروش کا اور مبارک موقع تھا [اِس کام کے لئے] پورا روس: تمام روسی دل و دماغ بیدار ہوا تھا۔ لوگ اپنی خوشی سے حضرت مسیح اور قدیم مسیحی (روسی) عقیدے پر جان چھڑکنے کے لئے بد مذہبوں کے خلاف نکلے تھے تاکہ دین ایمان اور خون میں شریک اپنے [سلاف] بھائیوں کے کام آئیں۔ میں پھر وہی الفاظ پورے یقین کے ساتھ دُہراتا ہوں...... بہت پہلے ایسا ہونا چاہیئے تھا، مگر تب اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

دستوئیفسکی کا کہنا تھا کہ اگر پیتر اعظم (۱۷ ، ۱۶) نے فن لینڈ کے جرمن علاقے کی سرحد پر پائے تخت قائم کرنے کے بجائے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کی پوری کوشش کی ہوتی تو سراسر نقصان میں رہتا، کیوں کہ ایک قدیم اور بے مثال یونانی تمدن کے مرکز سے نزدیک پہنچ کر، وہاں پائے تخت

بناکر ہم یونانی اثرات کے محکوم ہوجاتے۔" روسی قوت اور قومیت سر اُٹھانے سے پہلے گرفتار ہوجاتی۔" البتہ اب یہ وقت آگیا ہے کہ ہم پوری قوت سے قسطنطنیہ پہنچ جائیں کیونکہ سلاف بھائیوں کی آزادی روسی کمک کے بغیر ناممکن ہے۔" سلاف پن (slavdom) روس کے بغیر یونانیوں سے کشتی لڑنے میں تھک کر چُور ہو جائے گا اور یونانی تنہا چاہیں تو اس [فوجی] ہم کو سر نہیں کر سکتے۔ قسطنطنیہ فی الحال نہ ان کے ہاتھ آسکتا ہے، نہ دنیا کا اتنا اہم مقام ان کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا چاہیے۔"....

بالآخر دستوئیفسکی اپنے مسیحی انسانی فلسفے اور تالیفِ قلوب کے نظریے سے غافل ہو کر، یا اُسے توڑ مروڑ کر صاف لفظوں میں ترکی پر یلغار کی تبلیغ کرنے لگا۔

اپریل میں جنگ کا شاہی فرمان نکلتے ہی" روزنامچہ" کے پے در پے تین مضمون اسی پر لکھے۔ بتایا کہ گرجا گھروں میں لوگ خوشی کے مارے ایک دوسرے کو گلے لگا رہے ہیں، روپیہ، گھوڑے، گاڑیاں، اناج سب کچھ دے رہے ہیں اور جانیں دینے کے لئے تیار ہیں۔ ترکوں کو بلقان سے نکالنے کے لئے ہم قومی جنگ لڑیں گے۔

"..... ہمیں خود اس جنگ کی ضرورت ہے؛ صرف اس لئے نہیں کہ ہمارے سلاف بھائی ترکوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ بلکہ ہم خود بھی اپنی نجات کے لئے اُٹھ رہے ہیں۔ یہ جنگ اس ہوا کو صاف کرنے والی ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور جس میں ہم گھُٹے جا رہے تھے روحانی حبس کے سبب اور بے حسی کی نامردی کے باعث۔ ہمارے لال بجھکڑ چیخ پکار مچائے ہوئے ہیں کہ یہاں تو خانگی بدنظمی سے تباہ ہوئے جا رہے تھے [اوپر سے یہ جنگ]۔ ہمیں جنگ نہیں بلکہ ایک پائدار امن کی تلاش کرنی چاہیے تاکہ جانوروں اور لٹھ گنواروں کے بجائے ہم بھلے آدمی بن سکیں، تمیز، سلیقہ، ایمان داری اور آبرومندانہ جینا سیکھیں .....

روس کے ان مغرب زدہ، صلح پسند، ترقی پسندانہ "لال بجھکڑوں" کا مذاق اُڑانے کے بعد دستوئیفسکی نے یوروپ کے رئیسوں کا، روس کے یوروپی رقیبوں کا اور یہودی سرمایہ داروں کا مذاق اُڑایا ہے:

".... جس دن ہمارے روسیوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم اتنے طاقت ور ہیں [کہ یوروپی طاقتوں کی مرضی کے خلاف جنگ کا بار اٹھا سکیں] تب ہم اس مقام پر پہنچ جائیں گے جنگ کی ضرورت ہی نہ رہ جائے؛ تب یوروپ کو ہمارے دم خم کا پتہ چلے گا (ہم پر یقین آنا شروع ہوگا) اور پہلی بار یوروپ ہمیں دریافت کرے گا، جیسے اس نے کبھی امریکہ کو دریافت کیا تھا، لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ ہم پہلے خود کو دریافت کرلیں اور ہمارے ذی علم لوگ (انٹیلی جنسیا) ذہن نشین کرلیں کہ اب سے وہ اپنے

آپ کو عوام سے دور، دور اور بے تعلق نہیں رکھ سکیں گے ....."

۱۸۷۰ء میں جب وہ وطن سے دور مغربی یورپ کی جنگی تیاریوں اور جرمن لام بندیوں پر سخت طیش میں تھا، اُس نے اپنے خطوں اور پُرزوں میں لکھا تھا (مسیح کے مشہور قول کے مطابق) کہ "نہیں، جو بزورِ شمشیر بنایا جائے گا، وہ برقرار نہیں رہے گا....." وہ تمدن کس کام کا، جس کی خاطر انسانوں کی کھال اُتاری جائے! اب سات سال بعد وہی دستوئیفسکی لکھتا ہے:

.... امن کلبیت (Cynicism)، بے حسی اور اُکتاہٹ کو جنم دیتا ہے .... جنگ سائنس اور آرٹ کو تازہ دم کرتی ہے .... جنگ کے دنوں میں لوگ وقتی طور پر ضرور مصیبت اٹھاتے ہیں لیکن بہت آگے جاکر جتنا نقصان ہوا تھا اُس سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ لوگوں کے حوصلے بلند ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی قدر و قیمت جاننے لگتے ہیں۔ جنگ کے وقت میں مساوات پھیلتی ہے، غلام و آقا ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں، مشترک مقصد کی خاطر سرزمینِ وطن کی خاطر جان کی قربانی کے لئے .....

..... مثلاً سرائے کے دلّال (اشاک اکس چینج بروکر) آج کل انسانیت اور انسانی ہمدردی کی بڑی باتیں بناتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو انسانیت کا بیوپار کرتے ہیں۔ جنگ نہ ہو تو اس کے بجائے شاید انسانی خون ارزاں ہوجائے گا ....

یقین مانیے تو (خانہ جنگی کے سوا باقی) اکثر موقعوں پر جنگ وہ عمل ہے جس کے ذریعے قطعی طور پر کم سے کم انسانی خون بہاکر کم سے کم مصائب اور اُکھاڑ پچھاڑ کے راستے انٹرنیشنل امن حاصل کیا جاتا ہے اور قوموں کے درمیان کم و بیش نارمل تعلقات کی راہ بنتی ہے۔ ہے یہ افسوس ناک بات، لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا! ایک بار تلوار کھینچ لینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بار بار مصیبت بھری جائے ......

جن دنوں دستوئیفسکی بڑے طنطنے سے یہ الفاظ لکھ رہا تھا، کتکوف کے رسالے "نقیب روس" میں تالستائی کا ناول صرف اس لئے چھپنا بند ہوگیا کہ مصنف کھلے بندوں اِس جنگ کے خلاف تھا اور یہ جذبہ "آناکرے نینا" کے آخری حصّے میں اُبھر آیا تھا۔ "روزنامچہ" کی اشاعت چار ہزار سے چھ ہزار کو پہنچ گئی اور پبلک کے تقاضے سے مجبور یا محظوظ ہوکر آنا نے اس رسالے کے ساتھ ساتھ کتابوں کے بھی نئے نئے اڈیشن نکال دیے۔ قومی زندگی میں دستوئیفسکی کا نام سماجی اہمیت اختیار کرگیا۔ لوگ دور و نزدیک سے اسے اپنے ذاتی معاملات اور مشاہدات میں شریک کرنے لگے۔ روزانہ ڈھیر سی ڈاک آنے لگی۔ زمین، جائداد، عشق، اغوا، قتل، عدالتی کارروائی، دنیا بھر کے قصّے قضیے لکھ کر اسے بھیجے جاتے کہ ان پر "روزنامچہ" میں رائے لکھے، مشورہ دے، دخل دے یا روشنی دکھائے۔

کم و بیش آدھی عملی زندگی سرزمینِ وطن سے دور گم نام پڑے رہنے والے صاحبِ قلم کو بچھڑی ہوئی روسی جنتا نے بھینچ کر گلے لگا لیا تھا۔ اُدھر حکومت نے رسالے پر سے سنسر کی پابندی ہٹالی۔ اِدھر ایڈوانس اور آرڈر آنے شروع ہوئے اور اس سے پہلے کہ مغربی طاقتیں ترکی کی پشت پر آئیں اور روس کو آبنائے باسفورس میں شرم ناک شکست کا سامنا کرنا پڑے، دستوئیفسکی کے اعصاب، کثرتِ کار سے جواب دے گئے۔ اکتوبر، ۷۷ء کے شمارے میں اس نے ماہ نامہ "ادیب کا روزنامچہ" ایک دو سال کے لئے ملتوی کیے جانے کا اعلان کر دیا۔

"... اس فیصلے کی کئی وجہیں ہیں، میں تھک گیا ہوں۔ مرگی کے دورے زیادہ شدید ہو گئے اور پھر اگلے سال مجھے زیادہ فرصت بھی درکار ہوگی (اگرچہ شاید دو مہینے بھی کام کیے بغیر نہیں رہ سکتا) دل و دماغ میں ایک ناول بھرا ہوا ہے جو خود کو لکھوانا چاہتا ہے .... (۷، ار دسمبر، ۷۷ء)

سال ختم ہو رہا تھا جب دستوئیفسکی نے ایک رات نوٹ بک نکالی اور اس میں باقی زندگی کے لئے پلان درج کیا:

۱) ایک تو روسی "کندید"[1] لکھنا ہے۔
۲) یسوع مسیح کے بارے میں ایک کتاب لکھنی ہے۔
۳) اپنی یادیں اور
۴) چہلم کی مجلس پر ایک منظوم فاتحہ ("سوروکوینا" کے نئے نظم)

نوٹ: (اپنے آخری ناول کی تصنیف اور "روزنامچہ" کے سلسلے کی اشاعت کے علاوہ ہیں یہ اوپر کے کام۔ یعنی کم از کم دس سال کی مصروفیت کو کافی ہے یہ۔ اور اب میں ۵۶ سال کا ہوں)

اس پلان میں صرف ایک کی تکمیل ہو سکی ـــــ آخری ناول بالآخر جو اس کا سب سے بڑا کارنامہ ثابت ہونے والا تھا۔

فطری سادگی، نیکی، خوش اعتقادی اور صاف گوئی کا جو پتلا برسوں کی محنت سے بن کر تیار ہوا تھا وہ اس بے چیدہ، بدطینت اور ہوس بھری دنیا کے بازار میں کاٹھ کا اُلّو کہلایا ـــــ پرنس مِشکن

---

(۱) فرانسیسی انقلاب پسند مفکر اور مصنف والتیر کی شہرۂ آفاق تصنیف، جس کے فکر و بیان کی شعلہ فشانی نے فرانس کے متوسط طبقہ کو (اٹھارہویں صدی) گرما دیا ـــ ظا

جسے "ایڈیٹ" نام کے ناول میں مصنف نے ہیرو بنا کر پیش کیا، وہ دلوں کو موہ لینے والی سادگی کے باوجود ناکامی اور گم نامی کے غار میں کہیں ناپید ہو گیا۔ اب جیون سنگھرش میں صاف گوئی اور ریاکاری، اعتقاد و بداعتقادی، خیر و شر کے گھمسان میں وہ ایمان، اخلاق اور عمل کا صاف ستھرا پیکر اُتارنے اور اسے آزمائشوں میں ڈالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ "برادران کرامازوف" ناول کی تیاری میں چھوٹے بیٹے الکسے ئی (الیوشا) کو یہ منصب سپرد ہوا۔

ظاہر ہے کہ بچپن سے آج تک کے جتنے نقوش دل و دماغ میں محفوظ تھے، انھیں پھر سے اُجالنا لازم تھا۔ باپ کی وہ چھوٹی سی خستہ حال جاگیر، جہاں کسانوں نے بڑے میاں کو قتل کر دیا تھا، اب دستوئیفسکی کی بہن ویرا کے قبضے میں تھی۔ مصنف اپنے نسبتی بھائی کے دیہاتی بنگلے پر دکورستک صوبے میں سکون اور راحت کی خاطر روانہ ہوا تو راستے میں اسی جاگیر "دارووئے" کی طرف ہو لیا۔ وہاں بوڑھے کسانوں سے ملا جن میں سے بعض کو "فیودر" کا بچپن تک یاد تھا۔ کھیت اور باغ چھانے۔ درختوں کے نام خصوصاً قتل کی جائے واردات پر نوٹ کیے۔ کسانوں کے بچوں سے باتیں کیں۔

مرگی میں ننھے بیٹے کی موت نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس معصوم کی موت کو ایک نادانستہ قتل اور خود کو مجرم، شمار کرنے لگا تھا۔ موت و حیات کا مسئلہ بھی خیر و شر، گناہ و ثواب کے مسئلے کی بنیادی کڑی بن کر دستوئیفسکی کی روح میں ناخن گڑو رہا تھا۔ مسیحی تصوف میں اس نے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی اور اپنے نوجوان، مگر مفکر دوست ولادی مرسلوویوف[1] کو لیے ہوئے دور دراز کے مقام "اوپ تینا پستین" خانقاہ پر پہنچا، جہاں ایک سچا، خوش مذاق راہب تخون زادونسکی باہمہ اور بے ہمہ زندگانی کرتا تھا۔ بعد میں فادر آمبروسی سے ملاقات ہوئی۔ تالستائی جیسا مطعون مسیحی بھی خاص اسی سے دل کی بات کرنے خانقاہ گیا تھا۔ فادر آمبروسی سے دو دن ملاقات رہی جو تین دن کے سفر کے بعد نصیب ہوئی تھی، لیکن یہ سفر، ملاقات، ماحول، گفتگو، سبھی

---

(۱) سلوویوف نام کے دو بھائی گزرے ہیں اور دونوں دانشور۔ ایک مشہور ناولسٹ ہوا اور دوسرا یہ ولادی میر، جس نے ۲۴ ۲۵ برس کی عمر میں اپنے فلسفیانہ لیکچروں اور مقالوں سے دھوم مچا دی تھی۔ دستوئیفسکی ۱۸۷۳ء میں اس کی تقریر سننے گیا۔ اور ہم خیالی کی بنا پر اس کی جانب کھنچ گیا۔ چار سال بعد دونوں میں گاڑھی چھننے لگی، یہاں تک کہ آخری ناول لکھتے وقت اس کے خیالات سے استفادہ کیا۔ ناول کے تفصیلی پلان میں سب سے پہلے اسی نوجوان سے رائے طلب کی تھی۔ ظا

ناول "برادران کرامازوف" میں غیر شخصی طور پر نظر آتا ہے۔ ذرا دیکھتے چلیں کہ دستوئیفسکی نے کہاں کہاں سے اور کیسے کچا مال فراہم کیا ہے:

۱۶ مارچ ۱۸۷۸ء

..... میں ایک بڑا ناول شروع کرنے والا ہوں جس میں بچوں کا بڑا پارٹ ہوگا ۔ خاص کر سات اور پندرہ برس کے بیچ والوں کا.... آج کل انہی کا مطالعہ کر رہا ہوں، عمر بھر کرتا رہا ہوں.....تاہم آپ جیسے آدمی کے مشاہدے میرے لئے نہایت قیمتی ہوں گے.....تو براہ کرم بچوں کے بارے میں اپنی معلومات سے مجھے آگاہ کیجیے (کیا واقعات پیش آتے ہیں) ان کی عادتیں، سوال جواب، الفاظ، ان کی زبان، خصوصیات، خاندان کا ماحول، ان کے عقیدے، گناہ، بے گناہی؛.......

(ولادی میر میخائیلوف کے نام)

اسی تاریخ میں وہ اپنی نوٹ بک میں درج کرتا ہے کہ مجھے تحقیق کرنا ہے کہ آیا ممکن ہے کہ آدمی ریل کی پٹڑیوں کے درمیان ریل گزرنے کے بعد سلامت رہ جائے..... اور ہاں کارخانوں میں بچوں کے کام کی بابت اور اسکولوں کے متعلق معلومات فراہم کرنی ہے۔ کسی اسکول میں جانا ہے، لاوارث بچوں کا گھر دیکھنا ہے.....

۲۴ مارچ ۱۸۷۸ء

کسی گم نام آدمی کے بھیجے ہوئے ایک مضمون پر گرہ لگ گئی ہے۔ اس کے خیالات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے دریافت کرتا ہے:

.... آپ کے خیال میں سب سے مقدم اور لازمی..... یہ ہے کہ ہمارے آباواجداد، جو کبھی زندہ تھے، انھیں پھر سے زندہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ اگر کہیں اس پر عمل ہونے لگے تو بچوں کی پیدائش کا نبی خاتمہ ہو جائے گا اور وہی صورت حال سامنے آئے گی جیسے کلام پاک اور حشر نشر کے بیان میں پہلا حشر اجساد (مُردہ جسموں کا روز قیامت اُٹھنا) کہا گیا ہے......

جیسا کہ مذہب کی تعلیم ہے۔ روز محشر جسموں میں نئی جان پڑنا بالکل اصلی اور بدنی معنوں میں ہوگا یعنی ہم کو ہمارے بزرگوں سے الگ کرنے والی خلیج پٹ جائے گی؟..... وہ جسم، شاید ہمارے آج کے جیسے نہ ہوں گے، شاید مسیح کے جسم کی طرح ہو جو مردہ حالت سے اٹھنے کے بعد اور مقام ابدی کی طرف پرواز کرنے سے پہلے کی حالت تھی؟.....

(نکولائی پیٹرسن کے نام)

فادر آموروسی کی خلوت گاہ میں دستوئیفسکی نے موت و حیات کے ذکر میں معصوم بچوں کی ناگہانی

موت اور بیماری کا سوال بھی اٹھایا کہ آخر یہ کیا مشیّت ایزدی ہے اور اس کا جواز کیا ہوگا؟ فادر نے انجیل کے قصّوں کی ترجمانی میں بچوں کے درد اور موت کا تسلّی آمیز راز سمجھایا کہ وہ اوپر جا کر ننھے فرشتے بن جاتے ہیں، خدا کی بارگاہ میں معصومانہ زندگی پاتے ہیں اور اپنے بڑوں کی شفاعت کا سبب بنتے ہیں — یہی بات ناول میں فادر "زوسما" کا کردار ایک غم زدہ ماں کو تشفّی دیتے ہوئے کہتا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے مذہبی، صوفیانہ، سماجی، سیاسی اور فکری مسئلوں کو ایک لڑی میں پروتا ہوا یہ ناول آگے بڑھتا ہے، دستوئیفسکی وکیلوں سے قتل کے مقدمات کی مسلیں طلب کر رہا ہے، اخباروں کے تراشوں پر جھکا ہوا ہے، ایک ایک تفصیل کرید رہا ہے — انھی دنوں مرگی کے شدید دوروں کے ساتھ (جن کی تاریخ، وقت، اور شدت ڈائری میں نوٹ کرتا گیا) پھیپھڑوں سے خون آنا شروع ہوتا ہے۔ کھانسی اور نقاہت بڑھ گئی (emphysema) (رگ و پے میں ہوا ابھر جانے کی جان لیوا بیماری) لگ چکی ہے۔

> .....پانچویں کتاب (حصۂ پنجم) کا عنوان ہے 'مالہ وماعلیہ' (Pro and Contra)۔ اصل خیال... یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں، روس کے اندر اُن نوجوانوں میں جو حقیقت سے بالکل کٹے ہوئے ہیں انتہا درجے کی بدعقیدگی کو، کفر کے کلمات (Belasphamy) بکنے کو، اور تخریبی خیالات کی اصل جڑ بنیاد کو (افسانوی شکل میں) پیش کیا جائے، گمراہی اور نراج (انارکزم) کے ساتھ ان کا مکمل رد بھی ہوگا جو آج کل میں تیار کر رہا ہوں۔ میرے ہاں ایک کردار ہوگا۔ فادر زوسما، اس کے آخری وقت کے الفاظ سے یہ رد نکلے گا..... شروع کا انارکسٹ اکثر و بیشتر اپنے رائے میں لاجواب کرنے والا ہے۔ معصوم بچوں کا مصیبت زدہ ہونا کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ ان کی مصیبت زدگی سے ہیرو نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ تمام تاریخی حقیقت بیہودہ اور بے معنی ہے۔ معلوم نہیں، میں صحیح طور پر پیش کر سکا یا نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میرا ہیرو سو (۱۰۰) فیصدی اصلی ہے..... جو کچھ اس کی زبانی کہا گیا وہ برحق ہے..... بچوں کے بارے میں جتنی کہانیاں (ناول میں) شامل ہیں وہ فرضی یا افسانوی نہیں، سچی اور ٹھوس ہیں۔ اخباروں میں نکل چکی ہیں.....

نکراسوف ۱۸۷۷ء کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا۔ ماسکو کا پبلشر کتکوف تالستائی کے ناول سے (بلکہ مصنّف کے "بہکے بہکے اصلاحی" خیالات سے) فارغ ہو چکا تھا اور پھر اپنے قلم کار کی طرف مائل ہوا۔

بیوی کی خوش انتظامی نے قلم کا بازار بھاؤ اٹھایا تو کتکوف نے بھی اپنی بولی بڑھا دی۔ تین سَو روبل فی جزو (پرفارم)۔ بلکہ باندھے رکھنے کی خاطر دو ہزار روبل ایڈوانس بھی کر دیا۔

یہ ناول "نقیب روس" میں ڈیڑھ سال تک (۱۸۰۸-۱۸۰۹ء) قسط وار چھپتا رہا۔ اِدھر قسطیں تمام ہوئیں اُدھر کتابی صورت میں چھپنے کی تیاری ہوگئی۔ اگست ۱۸۰۹ء کی برسات ہے۔ بیوی نے EMS کے پتے پر، جہاں ڈاکٹروں کے کہنے سننے سے وہ آخری بار آرام کرنے گیا ہوا تھا، خبر دی کہ تمھاری بھابی کا سخت بیماری اور بےبسی میں انتقال ہوگیا۔ دستوئیفسکی کو صدمہ ہوا، لیکن صدمے کے ساتھ ہی اس نے اپنا ضمیر ٹٹولا کہ کہیں میری طرف سے تو کوتاہی نہیں ہوئی۔

> جہاں تک مجھ سے ہو سکا، میں نے ان کی مدد کی، ہاتھ اسی وقت روکا جب دیکھ لیا کہ نزدیکی قرابت دار، بیٹا اور داماد اس قابل ہوگئے ہیں۔ جس سال میرے (بڑے) بھائی کا انتقال ہوا، تب ہی میں نے اپنے حصے کے دس ہزار روبل کا ایک ایک پیسہ ہی..... نہیں لگا دیا بلکہ اپنی جسمانی طاقت اور ادبی حیثیت کو بھی قربان کر دیا..... بہت کیا..... بہت ہوا..... اب، میری پیاری، مجھے اپنی موت کا اکثر خیال آتا رہتا ہے۔ تمھیں اور بچوں کو کس حال میں چھوڑوں گا۔ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا ہے کہ ہمارے پاس رقم ہوگی، مگر کچھ بھی نہیں۔ یہ دیکھو۔ "کرامازوف" میں لگا ہوا ہوں، اسے تمام کرنا ہے۔ خوبی کے ساتھ، اور پھر خوب چمکانا بھی ہے ہیرے کی مانند۔ بے حد مشکل کام ہے۔ جان جوکھم کا معاملہ۔ آدمی کی ساری قوت سلب کر لینے والا۔ مگر دیکھو تو ہے بھی کانٹے کی چیز: اس سے میرا نام رہ جائے تو رہ جائے ورنہ کوئی امید نہیں۔ ناول بہر حال پورا کر کے اٹھوں گا۔ اور اگلے سال کے آخر میں "ادیب کے روزنامچے" (ماہ نامے) کی اشاعت کے لیے چندہ طلب کیا جائے گا۔ جو رقم اکٹھی ہو اس سے زمین جائداد بناؤں گا۔ پھر جیسے تیسے زندگی بسر ہونے اور رسالہ نکلنے کا انتظام ہو جائے گا..... بڑی محنت سے کام کرنا ہوگا..... مگر ابھی تم سے بحث باقی ہے..... تمھیں تو شہر سے باہر کار بن سہن پسند نہیں اور مجھے قطعی ذہن نشین ہو چکا ہے کہ (۱) اوّل تو زمین ایک سرمایہ ہے جو بچوں کے بڑے ہونے تک تین گنا ہو جائے گا، (۲) دوسرے یہ کہ جس کے قبضے میں زمین ہو اس کا حکومت کے سیاسی کنٹرول میں بھی عمل دخل رہتا ہے.....

دستوئیفسکی کو اپنے بعد کی، حیات بعد الموت کی، جسمانی اور ذہنی تصانیف (بچوں اور ناولوں کی) بڑی فکر ہے۔ آخر بیوی کی ہوشیاری کام کرتی ہے اور وہ اپنی نندوں سے بگاڑ کر کے خالہ خالو کی جاگیر میں شریکِ غالب ہو جاتی ہے۔ دستوئیفسکی کی بہنوں نے گھر آکر جھگڑا کیا، آنسو بہائے، جلے کٹے خط لکھے، مصنّف ہاتھ ٹیکتا

پھر "لیکن" اپنی "ایک زمین" اس کے قبضے میں آئی ہوئی تھی اور وہ خود سیانی بیوی کے قبضے میں۔
یہ وقت ہے کہ امیر کبیر، وزیر ایک طرف اور "سلاو وفل" (سلاف اصل کی طرف واپسی کے حامی) دوسری طرف دستوئیفسکی کو ہیلسٹوں، نراجیوں اور انقلابی جمہوریت پسندوں کے مقابلے پر امید گاہ شمار کرنے لگے تھے۔ اسے شام کی دعوتوں میں، جا بہ جا محفلوں اور ادبی جلسوں میں خاص طور سے بلایا جاتا، خود اسی کی زبانی تصنیف کے حصے سنے جاتے اور پبلک اداروں، خیراتی انجمنوں کے لئے چندہ کیا جاتا۔ ایسی ہی ایک محفل کا حال [سوانح نگار] استراخف نے لکھا ہے، جس میں وہ دستوئیفسکی سے کچھ خوش نہیں دکھائی دیتا۔ تاہم .....

...... ادبی فنڈ والوں کی طرف سے ۱۸۷۹ء میں ایک شام منائی گئی .... پڑھ کر سنانے میں دستوئیفسکی کا کوئی جواب نہیں ...۔ لیکن دستوئیفسکی تو پیشین گوئی کرنے پر اتر آیا۔ صحیح معنوں میں پیش گوئی۔ وہ [...... کالا فراک کوٹ پہنے] اسٹیج پر آیا اور باریک گرولوں میں اتر جانے والی، صاف آواز میں ناقابل بیان حد تک موہنے والے لہجے میں ناول "برادران کراما زوف" کا ایک نہایت لاجواب باب پڑھ کر سنانے لگا: 'جلتے ہوئے دل کا اقبال جرم' ..... میں نے اب تک ہال کے اندر ایسا سناٹا نہیں دیکھا تھا کہ ہزار آدمی کی روحانی زندگی فرد واحد کے موڈ میں یوں گھل مل گئی ہو۔ جب اور مصنفین پڑھ کر سنا رہے تھے۔ مجمع [شوق سے سنتا مگر] ان کے "میں" کو نہیں بھولتا تھا.... لیکن جب دستوئیفسکی نے پڑھنا شروع کیا تو سننے والا،.... بولنے والے کی طرح "میں" کا وجود بالکل بھلا بیٹھا (پوری طرح مسحور اور مبہوت ہو گیا) یہ سیدھا سادہ، کمزور و ناتواں، سکڑا ہوا کم رسیدہ شخص حاضرین کو اپنے طلسم میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ اس کی بے قرار گھومتی پھرتی اور گھورتی ہوئی آنکھوں کی زد میں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں حاضرین ڈوب گیے تھے..... (۲۲۶-۲۷)

دستوئیفسکی رفتہ رفتہ ناول نگار، افسانہ نگار، اڈیٹر اور مضمون نگار کے محدود دائرے سے پھیل کر اپنے خیالات کی یکسوئی کے ساتھ باثر سماجی شخصیت بنتا جا رہا تھا۔ "ادیب کا روزنامچہ" اور "برادران کراما زوف" کی اشاعت نے بالآخر اسے ایک ایسے موثر اور عظیم فن کار کی حیثیت سے منوالیا جس کے پاس روسی قوم

کے لئے اور روسیوں کے ذریعے باقی دنیا کے لئے ایک پیغام بھی تھا ۔۔۔ روسی مسیحیت کا پیغام، وہ مسیحیت جس سے جنّت ارضی کا دعوا کرنے والا رومن کیتھولسزم اور اس کا وعدہ کرنے والا سوشلزم دونوں ہی محروم ہو چکے ہیں۔ مغربی یوروپ کو سرمایہ داری اخلاق یا بداخلاقی اور بے لگامی نے زنگ کی طرح اندر ہی اندر کھالیا ہے، اس سے اب دنیا کی دکھی قوموں کو کچھ نہیں ملنے والا۔ البتہ روس کا حق پسند گنوار اپنے سادہ عقیدے قوّتِ برداشت اور بڑے دل کے ساتھ دنیا کی رہنمائی کا بار اُٹھانے نکلے گا..... روشنی نیچے سے آئے گی۔

برادران کراما زوف' میں بہت سارے کردار ہیں ۔۔ خدا کی الوہیت اور شیطان کی سفلی ترغیبوں کے دو نمائندے، مسیحی محبت، رحم اور مغفرت کا نمائندہ فادر زوسیما اور غضب و شہوت کے پیکر بڑے میاں کراما زوف اور ان کی داشتہ 'گروشینکا' ۔۔۔ باقی کردار ان کے درمیان جھول رہے ہیں۔ بڑے میاں کے چاروں بیٹے، دمتری، ایوان، الیوشا اور غیر قانونی جنونی فرزند سمر دیاکوف۔ چاروں گویا انسان کی مختلف قوتوں کے چار مدارج ہیں، کہ وحشیانہ جسمانی طاقت سے اوپر اُٹھتے اٹھتے اعلا خیالات (فکر انسانی) اور حسن کے شدید احساس پر تمام ہوتے ہیں۔ چاروں گویا مل کے روسی سماج کے مختلف پہلو ہیں، وحشی روس، مغرب زدہ بے عمل روس اور نیا تازہ دم عملی روس۔ نوعمر الیوشا ،، گناہ گاروں کے درمیان محبت سے بھرا ہوا ایک عملی انسان ہے۔ نئی نسل کے جوشِ عمل اور حسنِ کردار کا مجموعہ۔

کون ہے اس دنیا میں جو گناہ گار نہیں، ستم گر یا ستم زدہ نہیں، انھی کے درمیان جینا، ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنا، محبت اور مسرت کا پیغام دینا، اس دارالمکافات یعنی بے یقینیوں کے جہنّم کو جنّت بنانے والا ہے۔ ،، انسان نفی سے نہیں، اثبات کی بدولت خیر کی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ عقیدہ یا ایمان ہے جو اسے منفی سے مثبت بناتا ہے اور "ایک حقیقت پسند کے لئے عقیدہ معجزوں کا محتاج نہیں' بلکہ معجزے ہیں جو عقیدے کی بدولت ظہور میں آتے ہیں "

فادر زوسیما اس نوجوان الیوشا سے کہتا ہے: انسان کوئی ایسا گناہ کرنے کے قابل نہیں' جسے خدا کی رحمت چھوٹی پڑے۔ یقین رکھو کہ خدا تم سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ وہ تم کو تمھاری گناہ گاری میں' اور گناہوں کے ساتھ پیار کرتا ہے...... اگر تم میں جذبۂ محبت ہے تو تم خدا کے پیارے ہو۔ محبت ہے جو سارے داغ دھو دیتی ہے، ہر شے کو [تباہ ہونے سے] بچا لیتی ہے۔"

ہونے کو یہ الفاظ ناول میں خانقاہ نشین فادر کے ہیں، لیکن دراصل یہی دستوئیفسکی کے پیغام کا اور اس کے ناول کا نچوڑ بھی ہیں۔ ناول ان الفاظ پر نہیں بلکہ مسائل پر غور و فکر کرنے والے منجھلے بھائی ایوان کی معروضہ کہانی پر ختم ہوتا ہے جس میں اسقف اعظم (Grand Inquisitor) اور مسیح کا سامنا کر کے یہ جتایا گیا ہے کہ سکّہ بند دینِ مسیحی نے، خود حضرت مسیح کے دین کی اصل کو چھوڑ دیا، اس کی روحانیت سے رشتہ توڑ لیا! آزادی کے بجائے روٹی، سچّے عقیدے کے بجائے معجزہ اور حق پسندی کے بجائے دنیاوی اقتدار دے کر، اپنے خیال میں اُس نے عام انسانوں کی بہبودی کی راہ اپنائی اور اصل دین کو تاویلوں میں گم کر دیا۔

دستوئیفسکی نے دوٹوک تنقیدوں، تبصروں اور افسانوی زبان میں روس کے سامنے جو نئی تاویل پیش کی، وہ تاویل کے بجائے مستقبل کی بشارت نکلی۔ بڑے بڑے اس کی ملاقات کے آرزومند تھے، رسالے "گراژدانین" کے اصل سرپرست پبیدانوتسف کے ذریعے شاہی محل تک رسائی ہوئی، وہاں سے بلاوا آیا۔ دستوئیفسکی ولی عہد سے ملا، بلکہ خود شہنشاہ سے بھی ایک بڑے منصب دار کے یہاں تعارف ہو گیا۔ مصنّف حیران ہوا کہ بادشاہ سلامت نہ صرف اس کی بعض تحریروں سے واقف تھے، بلکہ ہمّت افزائی بھی کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیک یہی زمانہ تھا جب مطلق العنان زارشاہی کے خلاف دہشت پسند اور روپوش سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں دستوئیفسکی کا پیغام "مسیحی انکسار، برداشت اور محبت" اُوپر والوں کے لئے اور بھی معنی خیز ہو گیا تھا۔

"پیغمبرانہ" خطابِ عام

یہ سب تو تھا ہی، لیکن وہ واقعہ، جس نے دستوئیفسکی کے زیورِ کمال میں آخری ہیرا ٹانک دیا، ۸ رجون ۱۸۸۰ء کو ماسکو میں پیش آیا۔

ماسکو میں ۲۶ مئی کو عظیم شاعر پوشکن کی سالگرہ کے موقع پر زبردست ادبی جشن ہونے والا تھا۔ "روسی ادب کے دوست داروں" کی نامور انجمن کی طرف سے، جس نے دستوئیفسکی کو اس موقع پر تقریر کی دعوت دی۔ اسی ضمن میں شاہراہِ عام پر پوشکن کے ایک بے مثل مجسمے کی نقاب کشائی بھی ہونی تھی[1]۔ دستوئیفسکی کی تقریر تھی، جس نے صحیح معنوں میں پوشکن کی نقاب کشائی کی بلکہ خود ایک یادگار مجسّمہ بن گئی۔

---

(۱) پوشکن کا یہ مجسّمہ گورکی اسٹریٹ پر ایک باغیچے کے سامنے نصب ہے۔ اس کے پایوں پر شاعر کی نظم "یادگار" کے مصرعے نقش ہیں اور اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ بارہ مہینے اور چوبیس گھنٹے بے موسم کے تازہ پھول اس کے قدموں میں سجے رہتے ہیں۔ ظا

دستوئیفسکی بیماری اور تھکن کے باوجود بڑی تیاریوں سے تین دن پہلے پیترسبورگ ہوتا ہوا ماسکو پہنچ گیا۔ بیوی جو سائے کی طرح ساتھ رہتی تھی اس بار نہیں آئی۔ اسی روز ملکہ زارینہ نے انتقال کیا اور مرحومہ کے سوگ میں یہ تاریخی جشن دس دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

دو دن اور دو رات کے اجلاس طے پائے تھے؛ دن میں مہمان قلم کاروں کی تقریریں وغیرہ شام کو پوشکن کا کلام زندہ ادیبوں کی زبانی۔

تالستائی اور گنچروف کے بڑے نام تھے۔ دونوں نے شرکت سے انکار کر دیا۔ تالستائی نے اسے محض "تماشا" قرار دیا۔ اور گنچروف نے ماسکو والوں کی اس ادبی دل لگی کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ بڑوں میں اب تین ہی نمایاں تھے، تورگنیف، دستوئیفسکی اور اکساکوف (اور ظہیر کا خفیر اکساکوف بھی گیا!) اصل سامنا تو دو مخالف صفوں کے پہلوانوں میں ہونے والا تھا۔

جوں ہی اجلاس ملتوی ہونے کی اطلاع ملی، دستوئیفسکی نے گھر کو واپسی چاہی لیکن بااثر لوگوں نے سمجھا بجھا کر روک لیا۔ مصنف کی ذہنی حالت کا اندازہ اسی کے ایک ذاتی خط سے ہوتا ہے جو ۲۸ مئی کو لکھا گیا۔

"..... مجھے ٹھہرنا ہی ہوگا..... اصل بات یہ کہ میری یہاں ضرورت ہے، صرف "روسی ادب کے دوست داروں" کو نہیں، بلکہ ہماری پوری پارٹی کو، پورے اس خیال کو، جس کی خاطر ہم برابر تیس سال سے جان لڑائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ مخالفین (تورگنیف، کوالیفسکی اور یونیورسٹی کے قریب قریب تمام لوگ) قطعی طور پر سوچے بیٹھے ہیں کہ روسی جنتا کے ترجمان کی حیثیت سے پوشکن کی اہمیت گھٹا دیں ..... ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک اکساکوف رہ جاتا ہے ...... مگر الوان اکساکوف تھکا ہوا آدمی ہے اور پھر ماسکو والے بھی اس سے تھک چکے ہیں..... میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ پہلے کبھی ماسکو کے منظرِ عام پر دیکھا یا سنا نہ گیا ..... تاہم میری آواز میں ایک وزن ہوگا، یعنی ہماری طرف کے لوگ یہ میدان جیت سکیں گے۔ میں عمر بھر اسی کے لئے لڑتا رہا، اب میدانِ جنگ نہیں چھوڑوں گا ....."

ماسکو کے بڑے یا چھوٹے سبھی دستوئیفسکی کے مشتاق نکلے۔ ریستوران تک میں لوگ اٹھ اٹھ کر اسے دیکھنے لگتے۔ پہلی شام جب پوشکن کے کلام سے سُنانا تھا، وہ دیر تک زبان نہ کھول سکا۔ استقبالی تالیوں کی گونج نے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ۸ جون کا تاریخی دن آ پہنچا۔

آج اُسے پوشکن کا قرض چکانا تھا۔ پوشکن کے ناولٹ "حکم کی بیگم" (۱) میں ہرمن کے کردار نے اسے

[جرم و سزا کا] رسکول نیکوف دیا، پوشکن کے 'عفریت'، (Demon) نے "بھوت پریت" (ناول) کا نام اور موڑ دیئے؛ اور لیچڑ سردار' (Avaricious Knight) نے نونہال ("Недоросль") کے کردار 'ذولنگاروکی' کی حرص زر اور بے پناہ قوت کی ہوس بجھائی ....." (Troyat - ص19)

آج قوم کے چنے ہوئے عفریتوں اور نونہالوں کے روبرو دادا گی کا دن تھا۔

ایک دن پہلے تورگنیف کو ماسکو یونی ورسٹی کی فیکلٹی کا اعزازی ممبر بنانے کا اعلان نکلا ۔ یونی ورسٹی میں دھوم دھام کا اجلاس ہوا۔ مغربی خیالات کے حامی یونی ورسٹی والوں نے، جو یوں بھی 'سلاف والوں' سے خار کھائے ہوئے تھے، اپنوں اپنوں میں خوب دعوت نامے بانٹے۔ پہلے دن جشن کی افتتاحی تقریر بھی تورگنیف کو ہی کرنی تھی۔ وہ اپنی دل فریب، شستہ اور شائستہ شخصیت کے ساتھ اٹھا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس نے بنی تجی، نپی تلی تقریر کی اور جب آخری سوال پر آیا کہ آیا پوشکن ایسا قومی شاعر تھا جس کی زبان سے ایک نسل اپنی صفات کی ترجمانی کرتی ہے —— تو وہ ہوشیاری سے ٹال گیا:

"میں نہیں کہہ سکتا کہ ہاں —— وہ ایسا تھا، مگر خود میں انکار کی مجال بھی نہیں پاتا۔"

دستوئیفسکی اس شریفانہ "عیاری" پر برافروختہ تو تھا ہی، یہ دیکھ کر اور بھی مشتعل ہوگیا کہ حاضرین زور شور سے داد دے رہے ہیں۔ دوسرے دن تک وہ پیچ و تاب کھاتا رہا اور جب اسے پہلی تقریر کی دعوت دی گئی تو، کچھ تالیوں کے زور سے، کچھ جذبے کی شدت اور اعصابی ہیجان سے اس کی آواز تک نہ نکلی۔ رفتہ رفتہ زبان کھلی اور جب کھلی تو اصل سوال تک وہ برابر، گویا ایک سانس بولتا چلا گیا۔ (1) کیا مشرق پسند، کیا مغرب زدہ، مرد و زن، باری باری ہلکورے لے رہے تھے اور بعض گالوں پر جوش مسرت سے آنسو رواں تھے۔

دستوئیفسکی نے تقریر تمام کی تو شور مچ گیا "پیغمبر، پیغمبر ہو!" "جی نی ئیس ہو!" جی نی ئیس سے بڑھ کر ہو۔ لوگ اس کے ہاتھ چومنے لگے۔ بعض تو قدموں پر گر گئے۔ عجب محویت کا عالم تھا۔ ایک آدھ کو غش آگیا۔ اجلاس کی باقی کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ حد ہے کہ تورگنیف نے دوڑ کر دستوئیفسکی کو گلے لگالیا۔ اکساکوف نے خوشی کے آنسو اس کے کوٹ پر ٹپکائے ..... "دوست داروں کی انجمن" نے اُسے اپنا اعزازی ممبر بنانے کا اعلان کر دیا۔ حاضرین کی آنکھ کا تارا، بیمار مصنف شدت جذبات اور

---

(1) اس ناولٹ کا روسی سے براہ راست ترجمہ ماسکو (پروگریس پبلشرز) سے شائع ہو چکا ہے۔ مترجم ظا

تھکن سے تھرتھرا رہا تھا۔

رات کے اجلاس میں بھی اس پر پھول برسے اور جب اس نے پوشکن کی نظم "پیغمبر" پڑھنی شروع کی تو نحیف آواز ایسے آسمانی لہجے میں بلند ہوئی گویا پیغمبر کو غیبی بشارت سنائی جاتی ہو (۲) روسی پریس نے تقریر کے اقتباس چھاپ کر اسی شام تقسیم کر دیے۔

رات گئے جب دو دن کا تھکا ہارا مصنف اپنے ہوٹل پہنچا تو آنکھ نہ لگی۔ قرض کی آخری قسط ادا ہونی باقی تھی، وہ اٹھا، پھر سے کپڑے پہنے، گلدستے اٹھائے اور کرائے کی گھوڑا گاڑی میں پوشکن کے اس تازہ مجسمے پر گیا جو چاندنی میں نہا رہا تھا۔ گود میں بھر کر پھولوں کی سواری اس کے قدموں میں اتار دی چپ چاپ کھڑا رہا اور چلا آیا۔

تیسرے دن ایک اہم ادیب (تُرگنیف) نے دوسرے اہم ادیب (استرووسکی) کو لکھا: ہوشیار تورگنیف اور وہ پگلا دستوئیفسکی اس .... جشن سے ذاتی فائدہ اٹھانے میں بہرحال ہاتھ دکھا گئے۔

دستوئیفسکی پر تو اس کے کئی ہم وطن اخباروں نے لعن طعن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک نے تو یوں داد دی:

نہ بچارے کو تعلیم ملی، نہ ذہنی تربیت ہوئی، نہ سیاسی علم نصیب اور آخری کوتاہی یہ کہ پبلک سے خطاب کرنے والے کو جو ادب آداب برتنے لازم ہیں، وہاں دستوئیفسکی صفر ہے۔

دستوئیفسکی ماسکو کی اُن تقریبوں اور ان "تحریروں" کے تضاد پر غور کر رہا تھا کہ اسے پے در پے دو بار مرگی کے دورے پڑے۔ پھر بھی اس نے "روزنامچہ" کی اگلی اشاعت تیار کر دی اور اس میں اپنی پوری تقریر دے دی۔

موت کا سایہ

ریڈیکل خیالات کے اخباروں اور رسالوں نے دستوئیفسکی کو بخشا نہیں۔ مصنف کو پہلے سے اندیشہ تھا کہ کمین گاہ سے تیر آنے والے ہیں، اور جب وہ آئے تو عمر بھر کا بیمار زخموں سے تڑپے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ایک غم تھا۔ دوسرا غم، ناول کے بر وقت تمام نہ ہونے کا۔ اور تیسری چوٹ سگی بہن ویرا سے پہنچی

---

(۱) تقریر کا اقتباس ضمیمہ ۱ میں ملاحظہ ہو۔

(۲) اس کا بھی براہ راست منظوم اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے (ملاحظہ ہو مجموعہ "شعر و شاعری" مترجمہ ن ۔ ا ۔ مطبوعہ ماسکو)

جو پہلے تو بھائی کو طعنے دیتی رہی، پھر اگلے سال کے شروع ہوتے ہی خود آ پہنچی کہ خالہ خالو کی جاگیر میں سے ہم بہنوں کو پورا حصہ دلواؤ اور بھابی نے جو قبضا یا ہے اس سے فارغ خطی لکھ دو۔

ر نومبر ۱۸۸۰ء کو اس نے اپنے ایک دوست کو ناول کے آخری صفحات کے ساتھ لکھا:

..... لیجئے، میرے عزیز۔ ناول تمام ہوا (پہلے پلان تھا کہ اسے آگے بڑھائے گا) تین سال سے اس پر کام کر رہا تھا اور دو سال سے [قسطوں میں] چھپ رہا تھا..... کرسمس کی تاریخوں تک میں اس کا الگ اڈیشن نکالنا چاہتا ہوں..... ابھی ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ نہ کہیں۔ آپ جانیں، ابھی میں بیس سال جینے اور قلم چلانے کا ارادہ رکھتا ہوں.....

چھ مہینے پہلے "ادیب کا روز نامچہ" کا ایک ہی شمارہ (پوشکن والی تقریر اور تبصرے لئے ہوئے) نکلا اور دستوئیفسکی نے خوش ہو کر اپنے ہمدرد امیر پیدا نوستسف کو خبر دی تھی کہ "تنہا پیترسبورگ میں ہی اس کی تین ہزار سے زیادہ کاپیاں تین دن میں نکل گئیں۔ کُل چار ہزار دو سو چھاپی تھیں۔ شاید اس نمبر کا دوسرا اڈیشن نکالنا پڑے۔" "برادران کرامازوف" کا دوسرا اڈیشن دسمبر (۱۸۸۰ء) میں نکلا، وہ بھی چند روز کے اندر تین ہزار کی تعداد میں بک گیا۔

اسی خوشی کی لہر میں زخمی دل کو سامان سفر باندھنے کا اشارہ بھی مل گیا۔

۱۸۸۱ء کے لئے "روز نامچہ" کا پہلا شمارہ جلدی جلدی تیار کیا۔ ۲۵ جنوری کو وہ پرنٹر کے حوالے کر دیا۔ رات گئے، ہاتھ سے قلم گرا، وہ اٹھانے جھکا، میز سرکائی اور کمر سیدھی کی تو ہاتھ پر گرم گرم بلغم میں خون کے دھبے تھے۔ منہ صاف کر کے لیٹ گیا، بیوی کے آرام میں خلل نہیں ڈالا۔ کوئی چالیس گھنٹے بعد جب پھر منہ سے خون آیا تو گھبراہٹ میں ڈاکٹر بلایا گیا۔ طبیعت نے سنبھالا لیا اور مصنف نے سامانِ سفر تیار کر ڈالا۔

بچوں کو اندر بلایا، اخباری کارٹون دکھائے، خود ہنسا، انھیں ہنسایا۔ ڈاکٹر کی موجودگی میں پھر دورہ پڑا۔ دل کی ایک رگ پھٹ گئی تھی۔ غشی کے بعد ہوش میں آتے ہی اس نے آخری کلمہ پڑھنے، توبہ و استغفار کے لئے پادری کو طلبوایا۔ اس سے فارغ ہو کر سو رہا۔

دوسری صبح اُس نے وصیتیں شروع کر دیں، اور اسی اثنا میں "روز نامچہ" کی زیر طبع اشاعت کے پروف منگوائے، صفحہ سازی کی ہدایات دیں ـــــ اور عین اس رات، جب گھر والے اطمینان کی نیند سو رہے تھے، اس نے بیوی کو جگا کر بتایا کہ آج میں مر جاؤں گا، لاؤ انجیل سے فال نکالیں۔

ایک شمع روشن کرائی۔ انجیل کا خاص وہ نسخہ جو سائبیریا کی قید بامشقت پر جاتے وقت (۳۰ سال

پہلے کسی دسمبری سرفروش کی بیوی نے دیا تھا، منگوایا۔ آنکھ بند کر کے کتاب کھولی۔
سورہ متی کتاب سوم کی ۱۵-۱۴ آیت سامنے آئی۔ جس میں حضرت مسیح نے یوحنا کو جواب دیا ہے
کہ مجھے مت روکو، اور حق پر قائم رہنے کی ہدایت کی ہے۔ دستوئیفسکی نے مسکرا کر کہا دیکھو اس فال کی
تعبیر بھی یہی ہے کہ میں اب چل دیا۔ یہ کہہ کر زندگی کے بہترین لمحے، اور خوشیاں فراہم کرنے پر بیوی کا
تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ نو سال کے بڑے بیٹے فیدیا کو وہی اپنی کتاب عزیز ورثے میں سونپ کر
۲۸ جنوری (۹ فروری ۱۸۸۱ء) کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے آنکھیں بند کر لیں۔
خطرناک بیاری کی خبر عام ہونے کے ساتھ گھر پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ موت کی خبر نے سنسنی
پھیلا دی۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگ آخری خراج پیش کرنے کے لیئے دور و نزدیک سے ٹوٹ
پڑے۔ سڑک تک سوگواروں کا ہجوم تھا، ابھی جنازہ اٹھا نہ تھا کہ آننا سنیت کن کو وزارتِ مالیات
کی طرف سے خاص ہرکارے نے مہر بند لفافہ پہنچایا حسب الحکم اطلاع دی گئی تھی کہ مرحوم کے
پس ماندگان کو دو ہزار روبل سالانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ وہ خوشی سے ایسی سراسیمہ ہوئی کہ شوہر
کے کمرے میں خبر سنانے دوڑ گئی —— مگر وہاں کون تھا!
شہر کے سب سے اہم قبرستان (نیفسکی خانقاہ) کی طرف جنازہ چلا تو دو گھنٹے تک جلوس چلتا ہی
رہا۔ تیس ہزار سوگواروں سے راستہ بھر گیا تھا۔ دفن کے وقت ملک کے بڑے بڑے اہلِ قلم حاضر تھے
اور حبب سکو تیوف نے دستوئیفسکی کا مقصدِ حیات دہرایا:

میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

اور کہا کہ آج روس کا روحانی رہنما ہم سے رخصت ہو رہا ہے تو اپنے اور پرائے سب آنکھ پر
رُومال رکھ کر ساکت ہو گئے۔

اسقفِ اعظم اور حضرت مسیح

"..... ایک مرتبہ سارا کراما زوف خاندان رہبان زوسیما کی کوٹھری میں جمع تھا۔ رہبان کو معلوم ہوا تھا کہ ایوان نے کچھ عرصے پہلے ایک مضمون میں کلیسا اور ریاست کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر انسان کی روح کو بقا نہیں ہے تو نیکی کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں" یہ سن کر رہبان زوسیما نے کہا کہ "اگر تمھارا یہی عقیدہ ہے تو تم یا تو بڑے خوش نصیب ہو یا پھر بہت بدنصیب..... تمھارے دل میں ابھی اس مسئلے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور یہی بات تمھیں سب سے زیادہ دکھ پہنچائے گی، کیوں کہ تم کو ہر وقت خیال رہے گا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔" دراصل یہ مسئلہ ایوان کو ہر لحظہ پیچ و تاب میں رکھتا ہے اور اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ روح کی بقا کا سوال اور بہت سے مسئلوں سے وابستہ ہے جو ایوان کے دل اور دماغ کو مصروف رکھتے ہیں اور اُسے کسی عقیدے پر قائم رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ ایوان کو اپنی عقل اور دانائی پر اتنا گھمنڈ نہیں، وہ خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا، بلکہ شروع ہی سے اُسے تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ خدا کے وجود کی طرح تقدیر کی مصلحتوں کو سمجھنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ وہ یوم جزا کا معتقد ہے، اُسے یقین ہے کہ اُس روز انسان کے اعمال کا حساب ہوگا اور خدا کے عدل و انصاف اور اس کی رحمت کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بغاوت پر، یا جیسے کہ وہ خود کہتا ہے "خدا کو نہایت ادب کے ساتھ اپنے داخلے کا ٹکٹ واپس دے دینے" پر مجبور پاتا ہے۔ اُسے منظور نہیں کہ انسانی اخلاق کو عذاب اور ثواب کے قانون پر منحصر کیا جائے۔ ثواب کی اُمید میں انسان سے بے شمار تکلیفیں اُٹھانے اور دکھ سہنے کو کہا جائے اور پھر وہ گناہ کرے تو اُسے سزا دی جائے۔ ممکن ہے علت اور معلول کے نظریے سے ثابت کر دیا جائے کہ انسان خود اپنی مصیبت اور دُکھ کا ذمہ دار ہوتا ہے، مگر اس کی توضیح سے کسی کا دُکھ درد رتی برابر بھی کم نہیں ہوتا اور جس شخص کو دوسروں کے درد کا احساس ہو اور جو اس درد کو بالکل مٹانا چاہتا ہو، اُسے علت و معلول کے نظریے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے..... لیکن ایوان کا کہنا ہے کہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بھی بے انتہا اذیتیں پہنچی ہیں۔ ان کا کوئی سبب نہیں اور انھیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی جس کے دل میں ذرہ بھر محبت اور درد ہے، اس دنیا میں رہنا اور اس کے نظام کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ "میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ سب یکساں گنہگار ہوتے ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی مصیبتوں کا ان کے گناہوں سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن بچے تو مجرم اور گنہ گار نہیں ہو سکتے اور اگر دراصل وہ بھی اپنے والدین کی بدکرداریوں میں شریک ہو سکتے ہیں تو جس منطق سے یہ شرکت ثابت کی جاتی ہے وہ اس دنیا کی منطق نہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔" اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے :

"اگر سب کو دُکھ سہنا اس وجہ سے لازمی ہے کہ پھر دائمی مسرت حاصل کر سکیں اور زندگی میں کامل ہم آہنگی قائم

ہو سکے[1] تو پھر براہِ کرم یہ تو بتاؤ کہ بچوں پر دُکھ سہنا کیوں لازمی ہے؟" ایوان نے اِدھر اُدھر سے واقعات یہ دکھانے کے لئے جمع کئے ہیں کہ بچوں کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا جاتا ہے، وہ کس بے بسی سے خدا سے دعا مانگتے ہیں اور ان کے معصوم دلوں کو کیسے کیسے صدمے پہنچتے ہیں۔ اِن کے درد سے ایوان کو اس قدر تکلیف ہوئی ہے کہ وہ روزِ جزا کو، اس بصیرت کو، جو قیامت کے دن مشیت کے کُل راز کو واضح کر دے گی اور ہر دل سے کدورت اور شکایت دھو ڈالے گی اور اس وعدے کو کہ دنیا میں جو بے گناہ دُکھ سہے گا اُسے جنت کی مسرت اجر میں ملے گی اپنے دل کی تسلی کے لئے کافی نہیں پاتا ......

"مجھے بلند روحانی ہم آہنگی کی حاجت نہیں۔ یہ بلند ہم آہنگی بہت گراں ہے۔ اگر یہ اُس .... مظلوم بچی[2] کے آنسوؤں کے مول ملی جس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیاں سینے پر ماریں اور اس گندی کوٹھری میں اپنے آنسو بہا کر جن کا کسی نے بدلہ نہیں لیا اپنے پیارے اللہ میاں سے دعائیں مانگیں کہ مجھے مصیبت سے چھڑاؤ، بہت گراں ملی، کیوں کہ بچی کے آنسوؤں کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا، اور ان کا بدلہ لینا لازمی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر ہم آہنگی بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا بدلہ لیا جائے تو کس صورت سے .... کیا اس طرح سے کہ مجرموں کو سزا دی جائے؟ سزا دینے سے کیا فائدہ .... دوزخ کے عذاب سے کیا کام چل سکتا ہے جب یہ بچے جتنا دُکھ سہہ چکے تھے سہہ چکے ہیں اور پھر یہ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کیسی جس کے ساتھ ساتھ جہنم کا عذاب بھی ہے، میں تو چاہتا ہوں سب کی خطائیں معاف کرنا، سب کو محبت سے گلے لگانا، میں چاہتا ہوں دنیا سے دُکھ کو مٹا دینا اور اگر بڑوں کے دُکھ کے ساتھ بچوں کا دُکھ بھی شامل کرنا ضروری ہے کہ حق کی پوری قیمت دی جا سکے تو میں پہلے ہی سے بااصرار کہے دیتا ہوں کہ حق کی ہرگز اتنی قیمت نہیں ہو سکتی .... ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کی قیمت بہت اُونچی لگائی ہے۔ میری جیب میں اتنے دام نہیں کہ داخلے کا ٹکٹ خرید سکوں۔ اس لئے میں داخلے کا ٹکٹ بلا تامل فوراً واپس کر دوں گا۔ اور اگر ایمان دار آدمی ہوں تو جس قدر جلد ممکن ہو مجھے ٹکٹ واپس کر دینا چاہئے۔ الیوشا[3] میں خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتا، صرف اپنا ٹکٹ نہایت ادب سے واپس دے رہا ہوں۔"

ایوان کی بغاوت اور اس کی شکایتوں پر اگر واقعی غور کیا جائے تو اس سکون اور اطمینان کو خیرباد کہنا ہو گا جو مذہب اور عقیدے کے ذریعے سے انسان حاصل کرتا ہے۔ الیوشا، ایوان کا چھوٹا بھائی جس میں مذہب کا سچا جذبہ ہے اور

---

(۱) عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دینِ عیسوی کی سچی پیروی کی جائے تو دنیا میں کامل ہم آہنگی قائم ہو جائے گی۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اُن نیک لوگوں کو جنھوں نے حق کے لیے اپنی ساری مصیبتیں صبر سے برداشت کی ہیں، خدا کی مشیت کے تمام راز معلوم ہو جائیں گے، اس وقت گویا حق کی فرماں روائی ہو گی۔

(۲) ایوان اس سے پہلے اس بچی کا قصہ سنا چکا ہے۔ بچھونا گندا کرنے کی سزا میں ماں باپ نے سردی کے موسم میں اس کے کپڑے اُتار کر چہرے پر گو لیس کر پاخانے میں بند کر دیا اور خود جا کر چین سے سو رہے۔

(۳) ملک سے ٹی کرامازوف ایوان کا چھوٹا بھائی جو اس تقریر میں اس کا مخاطب ہے۔

جو دینِ عیسوی کا مخلص پیرو ہے اپنے پختہ عقیدے کے باوجود الیوشا ایوان کی کسی دلیل کو رد نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ آخر میں جب حضرت عیسیٰ کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے اور الیوشا حضرت عیسیٰ کے ایثار کو معصوموں کے درد کا کفارہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو ایوان اسے ایک مضمون سناتا ہے جو اس نے کچھ عرصے پہلے لکھا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "اسقف اعظم (The Grand Inquisitor) ہے اور اس میں رومن کیتھولک کلیسا کا ایک بڑا عہدے دار حضرت عیسیٰ کو، جو دوبارہ دنیا میں آئے ہیں، قید کر دیتا ہے اور قید خانے میں جا کر انھیں سمجھاتا ہے کہ اس نے انھیں کس وجہ سے قید کیا ہے اور دوسرے روز زندہ جلا دینے کی سزا کیوں دے گا۔ اسقف کسی شبہے میں نہیں ہے،، اسے بالکل یقین ہے کہ اس کا قیدی حضرت مسیح کے سوا اور کوئی نہیں، مگر اس کی وجہ سے وہ اپنے قیدی کو سزا دینے پر اور بھی تُل جاتا ہے،، اس لئے کہ اُسے دینِ عیسوی اور خود حضرت عیسیٰ کی ذات سے بہت شکایتیں ہیں۔ رات کو وہ اپنے قیدی حضرت عیسیٰ کے پاس جاتا ہے، انھیں وہ تین ترغیبیں(1) یاد دلاتا ہے جن سے شیطان نے انھیں بہکانے کی کوشش کی تھی اور اس پر بہت لعنت ملامت کرتا ہے کہ انھوں نے شیطان کا کہنا نہیں مانا(2)، پہلی ترغیب یاد دلا کر اسقف کہتا ہے: تجھے معلوم ہے کہ صدیاں گزرتی جائیں گی اور نوعِ انسانی اپنے علم کے ذریعے سے اس کا اعلان کرے گی کہ انسان مجرم نہیں ہوتے اور ظاہر ہے گناہ گار بھی نہیں، صرف بھوک کے مارے ہوتے ہیں" اور پھر "اگر روحانی غذا کے نام سے تیرے ساتھ ہزار اور دس ہزار ہوں گے تو ان لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں کا کیا انجام ہوگا جن میں اتنی قوت نہیں کہ روحانی غذا کی فکر میں اپنے پیٹ کی بھوک بھول جائیں۔ یا تجھے صرف تیرے ہزار و دس ہزار بلند حوصلے اور قوی ارادے والے پیرو عزیز تھے اور باقی کروڑ در کروڑ بلکہ ساحل کے ریت کی طرح بے شمار انسانی ہستیاں جو کمزور ہیں مگر تجھ سے محبت رکھتی ہیں، صرف اس مصرف کی ہیں کہ تیرے بلند حوصلے اور مضبوط ارادے والوں کا تختۂ مشق بنیں؟" اسقف کا عقیدہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ نے لوگوں کا پیٹ بھرنے کا ذمہ لیا ہوتا اور انھیں رُوحانی غذا پر پالنے کی فکر نہ کرتے تو انھیں بہت کامیابی ہوتی اور انھوں نے نوعِ انسانی کی محبت کا دعوا ثابت کر دیا ہوتا لیکن اگر انھیں یہ منظور نہیں تھا تو انھیں انسان کی رہبری کا دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس کی طرف شیطان نے اشارہ کیا تھا: یعنی معجزہ، اس لئے کہ غذا کے برابر اگر انسان کی

---

(1) پہلی ترغیب یہ تھی کہ شیطان نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ "ان پتھروں کو حکم دو کہ روٹی بن جائیں" مگر حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ "انسان صرف روٹی کے سہارے نہیں جیتا ہے۔" تب شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک اونچے مینار سے پرے جا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ اگر تمھیں خدا پر بھروسہ ہے تو نیچے کود پڑو۔ حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ خدا کی آزمائش کرنا منع ہے۔ آخر میں شیطان انھیں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور ملک روئے زمین کا منظر دکھا کر کہا کہ اگر تم میری پرستش پر راضی ہو جاؤ تو میں تمھیں ساری دنیا کا بادشاہ بنا دوں گا۔ حضرت عیسیٰ نے خفا ہو کر اسے اپنے سامنے سے بھگا دیا۔

(2) یعنی پہلی ترغیب جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں اشارہ کیا تھا کہ "انسان روٹی کے سہارے نہیں جیتا۔"

کوئی ضرورت ہے تو یہ کہ اُس کے ضمیر کا کوئی محافظ بن جائے اور ضمیر کا محافظ وہ اسی کو بنائے گا جو معجزے کے ذریعے سے اس کے ذہن پر جادو کر دے۔ اسقفِ اعظم حضرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے "کیا تو بھول گیا تھا کہ انسان چین آرام کو، بلکہ موت کو بھی اس پیچ و تاب سے زیادہ قابلِ برداشت سمجھتا ہے جس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی ذمہ داری اسے مبتلا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی آزادی کی انسان کو بہت ہوس ہوتی ہے، لیکن یہ آزادی اس کی سب سے بڑی مصیبت بھی ہو جاتی ہے ...... دنیا میں تین قوتیں ہیں، صرف تین، جو ہمیشہ کے لئے ان کمزور باغیوں کے ضمیر کو قابو میں لا سکتی ہیں اور اسے فریفتہ کر کے ان لوگوں کی مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور یہ تینوں قوتیں ہیں معجزہ، مذہبی اسرار اور اقتدار۔ تو نے پہلے، دوسرے اور تیسرے سب سے انکار کر دیا، اور اپنی ذات کو اس انکار کی ایک مثال بنا دیا .... تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کرتے ہوئے انسان اپنی عقیدت کے استحکام کے لئے خدا کی ذات کو کافی سمجھے گا اور اسے معجزہ کی حاجت نہیں ہوگی۔ لیکن کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جہاں انسان نے معجزے سے بے نیازی ظاہر کی وہ خدا سے بھی پھر گیا۔ کیونکہ انسان کو حق کی اس قدر تلاش نہیں ہوتی جتنی معجزے کی .... ہم نے تیری تحریک کی اصلاح کر کے اسے معجزے[1]، مذہبی اسرار[2] اور اقتدار[3] پر قائم کر دیا اور ان لوگوں کو اس پر بہت خوشی ہوئی ......"

عام انسان کے اور اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو عام انسانی فطرت کو سمجھتا ہے آئینِ عیسوی پر اس سے زیادہ بھاری اعتراضات نہیں کئے جا سکتے جو اسقفِ اعظم نے اپنے قیدی کو سنائے اور ان اعتراضات کو اگر ان دلیلوں میں شامل کر دیا جائے جن کی بنا پر آیوان نے کائنات اور زندگی کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا تو عقیدت اور مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ آیوان خود تسلیم کرتا ہے: "باغی ہو کر جینا مشکل ہے اور میں جینا چاہتا ہوں۔" اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ ہوں، خواہ یہ میری منطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ میں کائنات کے نظام کو درست نہیں مانتا تو کیا حرج ہے، مجھے وہ کونپل تو عزیز ہے جو بہار میں پھوٹ نکلتی ہے۔ مجھے اس نیلے آسمان سے تو محبت ہے، میری سرشت میں وہ چیز تو ہے جو کبھی کبھی کسی سے خاص شخصی لگاؤ پیدا کر دیتی ہے اور معلوم نہیں ہوتا کیوں، میں انسان کی بعض کوششوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جن کے مطلب اور مقصد سے زمانہ ہوا مجھے کوئی عقیدت نہیں رہی ......

آخری ناول "برادران کرامازوف" کے آخری باب کا خلاصہ ــــ جو پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "روسی ادب" کے دوسرے حصے سے [ضروری ترمیمات کے ساتھ] لیا گیا۔ اصل مقدمہ رسالہ جامعہ کے ۱۹۲۸ء والے شمارے میں چھپ چکا ہے۔ کتابی صورت میں موجود نہیں۔ فا۔

پوشکن — قومی شاعر

"روسی ادب کے دوستداروں" کے
تاریخی اجلاس میں ۵ جون ۲۰۰۰ء کی
ایک ہنگامہ خیز تقریر کا خلاصہ۔

اس یادگار اجلاس میں میری تقریر پر سلاف قوم پرستوں کے لیڈر ایوان اکساکوف نے علی الاعلان کہا کہ یہ ایک یادگار واقعہ (Event) تھی۔ مجھے تو صرف چار نکتے جتانے تھے:

۱) پوشکن پہلا شاعر تھا جس نے ہماری تعلیم یافتہ سوسائٹی کے نفسیاتی مرض کی تشخیص کی اور اُسے ریکارڈ کردیا۔ اُس نے پہچان لیا اور ہمیں وہ تعلیم یافتہ شخص دکھا دیا جو منفی ٹائپ ہے، بے چین آتما، جسے کسی کل قرار نہیں، نہ اپنی دھرتی پر بھروسہ، نہ دیسی طاقت پر؛ وہ رُوس سے بھی مُنکر ہے اور اپنی ہستی سے بھی۔ نہ اسے سماج والوں سے کوئی سروکار ہے، نہ کسی مقصدِ حیات سے۔ "بنجارے" طویل نظم کا "شہری الیکو" اور "ایوگے نی آنے گِن" نام کے منظوم ناول کا ہیرو "آنے گِن" دونوں اسی قماش کے اُٹھلی جنسیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اِن کرداروں نے بعد کے کئی ناولوں اور نظموں میں رُوپ بدل بدل کر اپنی سیرت اور صورت دکھائی۔ اور اسی بدولت ہم پر ہماری قومی بیماری کھلی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زخم کُرید کر دکھانے کے ساتھ وہ پہلا شخص تھا جو مرہم کی نشان دہی بھی کر گیا کہ "روسی سوسائٹی کا علاج، اس کی اصلاح اور حیاتِ تازہ ممکن ہے اگر وہ عام لوگوں کی راستی اپنالے"

۲) پوشکن پہلا شخص تھا جس نے اس روسی حسن کے فن کارانہ ٹائپ ہمیں دیے جو روسی اسپرٹ سے براہ راست صادر ہوتے ہیں، وہ حسن، جو عام جنتا کی راستی (Hamlet) میں ہے اور ہماری دھرتی کا باسی ہے"۔ ایک بار مرض کی تشخیص کر لینے کے بعد اُس نے زبردست امید ہمارے اندر بیدار کی، یہ کہ: اپنی جنتا کی اسپرٹ پر بھروسہ رکھو، یہی ہے، جو تمھیں راہِ نجات پر لے جائے گی۔

۳) پوشکن کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ دوسری قوموں، غیر لوگوں کی ذہنی صفات کو اپنے اندر سمو لینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں تو یورپ نے شکسپیر، سروانتے اور شیلر، جیسے عالمی پیمانے کے غیر معمولی دل و دماغ پیش کئے ہیں۔ شکسپیر نے آریائی نسل سے اُٹھنے والے ایسے ایسے یونانی و رسل، ہمہ گیر عالمی وسعت کے انسانی کرداروں کی شناخت میں انجانی گہرائیاں ناپی ہیں کہ اُن کرداروں کی ہمہ گیری کے ساتھ شکسپیر کے کمال میں عذر وذر کوئی کلام نہیں۔ تاہم اوتھیلو کی سیرت نگاری میں وہیں (Othello) کے افریقی نژاد "مور" کے بجائے انگریز آدمی جھلکتا ہے۔ پوشکن جب باہر کے آدمی کی سیرت نگاری کرتا ہے تو وہ روسی ماحول، روسی کردار کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ غیریت نہیں

رہنے باقی۔

۳) یہ صفت کہ خود کو دوسروں میں اس طرح ملا دیا جائے یا ان کی خصوصیات کو اپنے اندر الیسا جذب کر لیا جائے کہ غیریت کا پردہ باقی نہ رہے، یہ صفت "روسی کی قومی خصوصیت ہے"۔ پوشکن ایک بے عیب اور مکمل فن کار کی حیثیت سے اپنی قوم کی اس خاص صفت کا بھی سب سے مکمل نمائندہ اور ترجمان ہے۔

ہمارے لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے یہ خوبی کہ وہ دنیا بھر سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، سب سے تال میل کر سکتے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں ایک بار سے زیادہ اس کے تجربے ہو چکے ہیں۔ اگر ہم نے یورپ سے لو لگائی، اس کے گن گائے تو، تمام افراط و تفریط کے باوجود، بنیادی طور پر ہمارا یہ اشتیاق صرف جائز اور حق بجانب ہی نہیں بلکہ اس میں پاپولر اسپرٹ کا بھی دخل ضرور تھا۔ اصل میں اس کے سامنے ایک بڑا مقصد موجود تھا۔

میں جب کہتا ہوں کہ وہ دن آنے کو ہے جب ہماری فاقہ مست سرزمین بہر حال لب کھولے گی اور دنیا کو ایک نیا پیغام دے گی، تو اس پر ملامت کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے ہم اس قابل تو ہو لیں، معاشی، سائنسی، اور تمدنی لحاظ سے اتنی ترقی تو کر لیں، اس سطح تک تو پہنچ جائیں کہ "نیا لفظ" (نیا پیغام) لب پر لا سکیں اور یورپ جیسے ترقی یافتہ نظامِ زندگی کی قوموں کو اس نئے لفظ کا مخاطب بنا سکیں۔ میں بھلا، معاشی، سائنسی اور تمدنی ترقی میں روس کا مغربی قوموں سے کہاں موازنہ کرنے چلا ہوں۔ مجھے تو صرف یہ کہنا تھا کہ دنیا کی اور قوموں کے بہ نسبت روسی جنتا، روسی اسپرٹ میں ہی یہ صلاحیت تام ہے کہ وہ انسان کی عالم گیر بھائی بندی کا تصور سینے سے لگا سکے، اس نقطۂ نظر کو اپنا سکے جو ناگواری یا عداوت کی تلخی سے درگزر کرتا ہے اور تضادوں کو معاف کرنے کا گُر جانتا ہے۔

یہ بات محض بیہودہ ہے کہ ہماری مفلس، اوبڑ کھابڑ دھرتی تب تک اس بلند مرتبہ اور شان دار خواب کی اہل نہیں ہو سکتی جب تک وہ معاشی (اقتصادی) اور تمدنی لحاظ سے مغربی ملکوں کے برابر نہ پہنچ جائے۔ ہرگز لازم نہیں کہ معاشی سرو سامان پر ہی روحانی خزینوں کا دارومدار ہو۔ اوپری لوگوں کی پرت سے قطع نظر ہماری فاقہ مستی اور بدنظمی کا شکار سرزمینِ وطن، اس کے آٹھ کروڑ باشندے اپنے اندر اس قدر یکسانی اور یگانگی رکھتے ہیں، فردِ واحد کی طرح ہم آواز ہیں کہ یورپ میں اس خوبی کا نام و نشان نہیں ملتا۔ یورپ میں دولت کی فراوانی ضرور ہے، لیکن اس کی تمدنی بنیاد بھی ہل چکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی وقت یہ فلک بوس عمارت زمیں بوس ہو جائے۔ تب اس کی دولت بھی ملبے میں دب کر رہ جائے گی۔ پھر اسے آئیڈیل بنا کر ہمارے عوام کی آنکھوں میں کیوں جھونکا جائے؟ کیوں ہم اس کی غلامانہ تقلید کریں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس صورتِ حال میں روسی تن بدن (Organism) کو اپنے خاص قومی انداز سے پنپنے، اپنے اندرونی کس بل کے ساتھ اٹھنے

کی اجازت نہ ہو، اسے اس کی انفرادی ہستی سے محروم اور یورپ کی اندھی تقلید پر مامور رکھا جائے ہ مغربی طرز کے حامی بڑے زوروں میں سائنس اور سائنسی ترقی کی باتیں بناتے ہیں، ذرا بتائیں کہ تن بدن کی ساخت، (آرگن ازم) ہو نا کیا ہے! کسی بحث میں ایک نے عذر کرتے ہوئے کہا کہ "جتنا ایسا اور ایسا نہیں ہونے دے گی، ہمارے مغرب زدہ نے اطمینان سے جواب دیا" تو جنتا کو خاک میں ملا دو" یہ حالت ہے ان حضرات کی مردم بے زاری کی۔ وہ سیدھے سچے روس کی روح سے ناآشنا ہیں۔ وہ روح جو پوشکن کی نثر و نظم میں بے نقاب سامنے آتی ہے۔

"سلاووفل" (سلاف قوم پرستوں) اور مغرب زدہ جدیدیوں کے درمیان جو تناتنی چلی آرہی ہے، میری تقریر کے نکات سے ظاہر ہوا کہ وہ محض ایک غلط فہمی کے سبب قائم تھی۔ مغرب کی جانب رجحان ایک تاریخی مجبوری بھی رہی ہے اور روسی روح کی ہمہ گیری کا تقاضا بھی۔ لیکن مغرب کی اندھی نقالی روسی آتما کی گہرائی اور گیرائی سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اس پر میں نے زور دیا۔ اور دونوں پارٹیوں کے نمایندوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ اور بہت ساری غلط فہمیاں دُھل گئیں۔

میں نے اس مختصر سی تقریر میں پوشکن کے تعلق سے جستہ جستہ ان باتوں کا ذکر کیا تھا:

پوشکن عین ایسے وقت سامنے آیا جب پیتر اعظم کی اصلاحات کے سَو سال بعد ہمارے سماج میں اپنی ہستی کے شعور نے سر اُٹھانا شروع ہی کیا تھا۔ پوشکن کی تحریروں نے ہماری دھندلی راہوں کو روشن کرنے میں بڑا کام کیا اور اس معنی میں وہ مستقبل کی پیش گوئی اور انکشافِ حقیقت ہے۔

میں پوشکن کے کاموں کے تین دَور دیکھتا ہوں۔ اوّل وہ جب اس نے اپنا منظوم ناول "ایوگینی اونے گین" سوچا اور اس پر قلم اٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دورِ اوّل میں پوشکن نے یورپ کے [رومانی] شعرا پارنی، آندرے شینیے اور خصوصًا بائرن کی نقل کی۔ ہاں، اس کے جی نی یس کے اٹھان پر ان شعرا کا گہرا اثر تھا لیکن محض نقالی نہیں۔ نظم "بنجارے" کا "الیکو" لیجئے۔ اس کی سیرت میں شاعر نے ایک مارا مارا پھرنے والا، وطن کی سرزمین سے بے تعلق و اُکتایا ہوا روسی دکھایا ہے جس کی جڑیں سماج میں نہیں، ہم وطنوں سے جس کا کوئی سمبندھ نہیں۔ یہ شخص تاریخ کے ایک دَور کی لازمی پیداوار تھا۔ یہ بے خانماں شخص تب بھی آوارہ گرد تھا اور اب تک ویسا ہی ہے۔ روس کی اس تعلیم یافتہ نسل کا ایک نمونہ، جس کی جڑیں اپنی دھرتی سے باہر تھیں۔ اب وہ سوشلزم کے خیالات کو اپناتا ہے۔ جو "الیکو" کے زمانے میں نہیں تھے۔ اب وہ اس نظریے کے ساتھ نئی زمینوں پر ہل چلاتا ہے یہ سوچ کر کہ یوں مُراد مل جائے گی اور خوشی نصیب ہوگی، صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پوری نسلِ انسانی کے لئے۔ یہ وہی روسی دُکھیا آدمی ہے جس کو راحت ملتی ہے عالم گیر خوشی اور راحت کے خیال سے ہے، یہ وہی الیکو ہے —— بدلے ہوئے روپ میں۔

پوشکن کے زمانے میں پڑھے لکھے روشن خیالوں کی بڑی تعداد تو، آج کل کی طرح، سرکاری دفتروں میں، ریلوے میں، بینک میں اور دوسرے روزگاروں میں لگی ہوئی تھی، چین آرام کی زندگی، تاش کے کھیل، تفریحیں اور لیکچربازی بہت ہوا تو اس لبرل ازم سے جی بہلا لیا جس میں یورپی سوشلزم کا مسالہ بھی پڑا ہو۔ زمین سے بے تعلقی، فطرت سے دوری، فیشن ایبل سوسائٹی سے اُکتاہٹ۔ کسی شے کی گم شدگی کا احساس۔ شکایت زدہ رہنے کی عادت۔ اپنے وجود سے باہر کی دنیا میں، آوارہ گردی میں، بنجارہ ٹولے میں، قانون کی رو سے باہر جینے والوں میں وہ اپنے دل کا چین تلاش کرتا ہے۔ کبھی اسے یورپ میں ڈھونڈتا ہے۔ نہ وہ آج تک سمجھا، نہ سمجھے گا کہ سچائی، راستی، کلمۂ حق خود اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ جو شخص اپنے وطن میں اجنبی ہو، جسے محنت مشقت کی لگن نہ ہو، جو بند دیواروں کے اندر پلا بڑھا ہو، جو روس کی چودہ[14] منزلہ شہری حیثیتوں میں سے کسی ایک درجے سے وابستہ ہو، وہ گھاس کا تنکا ہے جسے تیز ہوا نے جڑ سے اُکھاڑ لیا۔ آخر بنجاروں کی ایک خود سر، بے لگام لڑکی "زیمفیرا"، اسے وہ پناہ گاہ نظر آتی ہے جو عادات اور قانون اور درجہ بدرجہ حیثیتوں کے جال سے نکالنے میں شاید مدد کر سکے، نتیجہ کیا ہوا؟ جب اس لڑکی نے بھی قانونی پابندیوں سے آزاد وطیرہ اختیار کیا، "الیکو" نے اسے مار ڈالا۔ عالم گیر مسرت کا خیالی شیدائی، ساری دنیا سے ہم آہنگی تو کیا پاتا، بنجاروں تک سے میل نہ کھا سکا، بنجاروں نے انتقام لئے بغیر اُسے نکال پھینکا۔

آزاد زندگی کے نہیں ہیں یہ راستے
آزادی تجھ کو چاہئے صرف اپنے واسطے!

پوشکن نے اوّل دور میں "الیکو" کی، پھر "انے گن" کی پیکر تراشی کر کے مریض ذہنیت کا وہ سرکش تعلیم یافتہ شہری روسی دکھا دیا جو روس میں یورپی طرزِ زندگی کا ایک ناقص نمونہ اور بے مقصد ہستی ہے، مارا مارا پھرتا ہے۔ اپنے اردگرد کی دنیا غیر بلکہ نامحرم نظر آتی ہے۔ دیس بدیس گھومنا محفلوں میں وقت کاٹنا، بے سبب جان دینا یا جان لے لینا اور ہم وطنوں کے سیدھے سادے عقائد سے بے زار ہونا اس کی شان ہے۔ ہونٹوں پر زہر خند، پیشانی پر تحقیر، یہ ہے اس کا چہرہ۔ مگر اس کے برعکس روس کی نئی عورت ہے تاتیانا۔ مضبوط کردار، جو اپنے پیروں پر، اپنی زمین پر ثابت قدم ہے۔ وہ انے گن سے زیادہ گہری اور معاملہ فہم ہے۔ اس منظوم ناول کی ہیروئن دراصل وہی روسی عورت ہے۔ تاتیانا کے جیسے دلبا دل کش اور اصلی روپ اگر پھر کہیں نظر آتا ہے تو ایوان تورگینیف کی لیزا میں۔ تاتیانا کل تک ایک قصباتی الھڑ سی لڑکی تھی معصومانہ محبت کی مورت۔ اس کی سادہ وضع انے گن کو نہ لبھا سکی۔ انے گن نے اس کی تحقیر کی

وقت گزر گیا۔ اب وہی تاتیانا ہے، پائے تخت کی اونچی سے اونچی سوسائٹی۔ عزت آبرو، مرتبہ، سب کچھ نصیب ہے۔
اب آنے گن اس سے محبت جتاتا ہے۔ تو کیا تاتیانا اپنے عمر رسیدہ جنرل شوہر کو دغا دے کر اس حسین اپلی ہرجائی
جوان کا کہنا مان لے؟ —— نہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی نے اسے تباہ نہیں کیا۔ وہ آج بھی اپنے اسی قصبے کی
سیدھی سچی زندگی کی دل کشی سنبھالے ہوئے ہے اور روسی عورت باوفا بیوی کا منصب پورا کر رہی ہے۔
اس سے دغا فریب ممکن نہیں۔ انسانی خوشی یا شادمانی صرف کاروبارِ الفت تک تو محدود نہیں ہوتی! اس میں
روح کی نہایت بلند مرتبہ ہم آہنگی درکار ہے۔ وہ انےگن سے اپنی دیرینہ محبت کا اقرار کرتی ہے مگر اسے
برتر راحت کی خاطر، راست بازی کی خاطر قربان کر دیتی ہے۔ آنے گن کا کیا ہے، وہ اپنی ہستی سے، اپنے
احساسِ برتری سے، بلکہ محض اپنے واہمہ کی صورت آفرینی (٧٤ ١٥ ٥٥ و) سے پیار کرتا ہے۔ وہ خود فاتنائی
ہے۔ ایک چلتا پھرتا سایہ۔

تاتیانا کا مضبوط کردار، اس کی سادگی اور وفا، اپنی سرزمین، اپنے لوگوں اور ان کی پاکیزگی سے مضبوط
رشتے کا نشان ہے۔ پوشکن نے اس کے جیسے سچے روسی کرداروں کی صورت گری کر کے گویا روس کے مستقبل کی نشان
دہی کی ہے اور اس معنی میں یہ پیغمبرانہ پیش گوئی ہے۔ یہی وہ دوسرا دور ہے جس میں انےگن ناول کا خاتمہ لکھا گیا۔
جب شاعر منفی زندگی سے مثبت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تاتیانا کی سیرت کا ناول پر حاوی ہو جانا اسی دور کی
دین ہے۔

ایک بڑی صفت اس شاعر کی یہ ہے کہ وہ تہہِ دل سے، جان و تن سے اپنے لوگوں سے ہم آہنگ اور یک جان ہے۔
دوسرے اہل قلم لکھتے ہیں لوگوں کے بارے میں۔ نظر آتا ہے کہ اشراف لکھ رہے ہیں عام مخلوق کے متعلق۔ مگر پوشکن
اس قدر اپنے لوگوں میں گھلا ملا ہے کہ بچکانہ جذباتیت کی حد تک چھو لیتا ہے۔ "اگر پوشکن نہ ہوتا تو اپنی روسی انفرادیت
پر، قومی بل بوتے پر ہمارا اعتماد، یورپی قوموں کے خاندان میں اپنے مستقبل کے آزادانہ مشن پر ہمارا ایمان اتنی
اٹل، اتنی شکتی کے ساتھ ظاہر نہ ہوا ہوتا۔ یہ بات پوشکن کے تیسرے دور کی جا بجا نیں اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ دور
بالکل ہی الگ الگ نہیں ہیں۔ البتہ ان کی جداگانہ شناخت ممکن ہے۔ تیسرے دور کی شناخت یہ کہ اس میں عالمی
خیالات، دوسری قوموں کی شاعرانہ جھلکیاں، اور دوں کا لب و لہجہ اور ان کی تصویریں نظر آتی ہیں۔" تنہا
پوشکن ہے دنیا بھر کے شعراء میں، جسے یہ خوبی میسر آئی کہ اپنے وجود میں باہر کی کسی بھی قوم کو [اس کی
خصوصیات کے ساتھ] اُتار لے اور سامنے لے آئے۔ فاؤسٹ والا منظر ملاحظہ ہو اور ...... وغیرہ
اگر نیچے پوشکن کا نام نہ ہوتا تو آپ کو گمان نہ گزرتا کہ یہ کسی غیر جرمن مصنف نے لکھا ہوگا ...... اسی طرح
نظم "پلیگ کے دنوں کی دعوت" میں انگلینڈ کی جھلک دکھائی دیتی ہے ...... پھر اس کا موازنہ ان

نظموں سے کیجیے جہاں قرآن کے آیات کا رنگ لیا گیا ہے۔ کیا وہاں وہ بالکل مسلمان نظر نہیں آتا ؟ کیا اس میں قرآن کی ہی اسپرٹ، تلوار کی جھنکار، اس کے عقیدے کی سادہ پُرشکوہ کیفیت اور اس کی تہدیدی شان نہیں جھلکتی ؟ .... "یہی صورت اور نظموں میں بھی ہے، جہاں جس کا ذکر آیا ہے، اسے شیشے میں اُتار لیا ہے۔ یہ شخصیت کی حیرت انگیز گہرائی ہے کہ اپنی اسپرٹ میں غیر قوموں کی اسپرٹ سمولی۔ اس لحاظ سے وہ بے مثال ہے۔ خاص اسی پہلو میں پوشکن اپنے روس کی قومی طاقت کا (اس کے جلال وجمال کا) آئینہ بن گیا ہے۔ ہمارے مستقبل کی اُٹھان میں اس صفت کی قومی اہمیت ہے اور اس لئے بھی پوشکن پیغمبرانہ حیثیت سے ہمارا قومی شاعر ہے۔" آخر روس کی قومی اسپرٹ کی قوت اس کی اُمنگوں میں، آخری منزل میں، ہمہ گیری میں، اور ہمہ گیر انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی ہے ! پوشکن جب پوری طرح قومی شاعر بن چکا، اپنے یہاں کی جنتا اور اس کی قوت وجلال سے رشتہ جوڑ لیا تو فوراً قوم کی تقدیر پر اس کی نظر پہنچ گئی۔ اس صفت میں وہ کشف وکرامات اور پیغمبری مقام کا شاعر ہے۔ " پیتر اعظم کی (شروع ۱۸ویں صدی) اصلاحات کو جب روسی عوام نے گلے اُتارا تب نہ پیتر محض تنگ نظرانہ افادی نظریے کا پرستار رہ گیا نہ روسی جنتا۔ بلکہ ایک انجانی جبلّت تھی، ایک پوشیدہ بے صبری جو انھیں مستقبل کا بار اُٹھانے اور بڑے مقاصد کے قابل بننے کی طرف نکالے لئے جا رہی تھی۔ لاشعوری طور پر مگر پختگی کے ساتھ وہ اپنے آنے والے منصب کی آرزو میں قدم بڑھا رہے تھے۔ ہم ایک عالم گیر اور عام انسانی بھائی چارے کے حق میں۔ محبت ورفاقت کے جذبے سے سرشار، عناد سے نہیں بلکہ دوستی کے تقاضے سے بڑھ رہے تھے، تب ہماری روحوں میں نسلی امتیاز سے بالکل پاک، دوسری قوموں کی جی نیس اُتار لینے، اپنا لینے کی چاہ بھی موجود تھی۔ یعنی اس عمل کے لئے ہماری آمادگی ظاہر ہو رہی تھی کہ عظیم الشان آریائی نسلوں کی تمام قوموں کے ساتھ ایک ہمہ گیر اور آفاقی برادرانہ اپنا پن اختیار کر لیں ..
..... واقعی روسیوں کی تقدیر، لازماً کُل یوروپی اور کُل عالمی حیثیت ہے۔ سچا اور کھرا روسی ہونے کا مطلب ہے کہ آدمی خود کو تمام آدمیوں کا بھائی گردانے، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ وہ یونی ورسل آدمی ہو۔" یہی وہ نکتہ ہے جس سے بے خبری دراصل "سلاو دغل" اور مغرب زدہ حلقے میں بڑی غلط فہمی کا سبب بن گئی۔ سچے روسی کو یوروپ اور باقی آریائی نسل کی تقدیر اتنی ہی عزیز ہوگی جتنا خود روس کا مستقبل، اپنے وطن کی قسمت۔ کیوں کہ ہماری تقدیر میں شامل ہے وہ عالم گیری جو بزورِ شمشیر نہیں، بلکہ برادرانہ جذبے اور انسانی رفاقت کے بل پر قائم ہوئی ہو ..... یوروپ والوں کو کیا خبر کہ وہ ہمیں کتنے عزیز ہیں۔ آج نہیں تو کل دیکھ لینا کہ آیندہ کا ایک ایک روسی اس بات کو ذہن نشین کرے گا کہ سچا اور کھرا روسی ہونے کے معنی

بھی ہیں، تمام یوروپی تنازعوں کی جگہ تال میل پیدا کرنے کی کوشش، اپنی انسان نوازی، آدم دوستی کے خمیر میں یوروپ کے دکھوں کا حل ڈالنے کی سبیل۔ اور اس طرح اپنے لبوں پر زبردست عالمی ہم آہنگی کا، تمام قوموں کی برادرانہ اخوت کا وہ آخری لفظ لا نا جو مسیحی تعلیمات کے قانون کا پابند ہوگا۔

جب میں کہتا ہوں کہ روس کی کمزوری [خاک بسر] دھرتی کو غیب سے یہ مقدر ہوا ہے کہ وہ عالمی درد کو اپنے اندر سمیٹے اور اس کا ترجمان بنے تو مجھے اس کی کارفرمائی اپنی تاریخ میں، اپنے یہاں کے لائق لوگوں میں، اور پوشکن کی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت میں نظر آتی ہے...... پوشکن نے اپنے تصنیفی کارناموں میں کم از کم روسی اسپرٹ کی یہ عالم گیری ضرور ظاہر کردی ہے۔ یہ بھی بڑا واضح اشارہ ہے، اگر میں صرف خیالی قلعے بنا رہا ہوں تب بھی پوشکن کے ہاں اس کے ٹھوس نمونے اور ثبوت مل جائیں گے۔ اگر اس نے اور عمر پائی ہوتی تو وہ روسی روح کے اور بھی شان دار نمونے دے جاتا جسے ہمارے یوروپی بھائی سمجھ پاتے اور انھیں بھی ہماری طرف جھکنے کی اور زیادہ رغبت ملتی...... اگر پوشکن اور جیا ہوتا تو غالباً ہمارے آپس میں بھی اختلافات اور تناتنی کی یہ نوبت نہ آئی ہوتی۔ لیکن مشیت خداوندی میں کس کو چارہ ہے۔ وہ ایسے وقت دنیا سے اٹھ گیا جب تخلیقی قوت پر شباب آیا ہوا تھا۔ اور جاتے جاتے اپنے ساتھ قبر میں ایک بڑا راز بھی لے گیا۔ اب ہم اس کے بغیر ہی وہ گتھی سلجھانے کے لئے بے چین ہیں۔

فیودَر میخائیلووِچ دستووئیفسکی کی زندگی کی خاص خاص تاریخیں

۱۸۲۱ء [نئے کیلنڈر سے] گیارہ نومبر ۱۸۲۱ء کو ماسکو میں پیدا ہوا۔

۱۸۳۱ء باپ نے ماسکو سے ڈیڑھ سو کلومیٹر پر "تولا" دارو دوے" کی ایک زمین داری خرید لی تاکہ پنشن کے بعد گزر اوقات کا سہارا رہے۔

۱۸۳۳ء تین سال کے لئے ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کیا گیا۔

۱۸۳۷ء کم سخن دُکھیاری ماں ماریا فیودرونا انتقال کر گئی۔

۱۸۳۸ء باپ نے فیودر کو اس کے بڑے بھائی میخائیل کے ساتھ پیترسبورگ کے ملٹری انجنیرنگ اسکول میں داخل کر دیا جہاں پانچ سال کی تعلیم بمشکل تمام کی۔

۱۸۳۹ء یہیں خبر ملی کہ باپ کو اس کی جاگیر کے کسانوں نے [انتقاماً] جان سے مار ڈالا۔

۱۸۴۳ء ملٹری انجنیرنگ کے دفتر میں ڈرافٹسمین کلرک کی نوکری مل گئی، جو سال بھر بعد اس خیال سے چھوڑ دی کہ ادب میں ہمہ تن مصروف ہونا ہے۔

۱۸۴۴ء عظیم فرانسیسی ناول نگار بالزاک کے ناول "ایو ژنی گراندے" کا ترجمہ شائع کیا۔

۱۸۴۵ء خطوں کی شکل میں ناولٹ "بچارے لوگ" لکھا، جو سال بھر بعد رسالے میں چھپنے سے پہلے ہی شہرت کا سبب بن گیا۔

۱۸۴۶-۴۷ء دوسرا ناولٹ "ڈبل" (دووئے نِک) اور تیسرا "مکان مالکہ" (خزائیکا) یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ پھر 'کمزور دل'، 'ایمان دار چور' اور 'روشن راتیں'، 'ڈبنے لی یے نوچی) اور "مسٹر پروخارچن" شائع ہوئے۔ جن میں "ڈبل" اور "روشن راتیں" کو شہرت ملی۔ مشہور ناولٹ "نے تچکا نزوانووا" ناتمام رہا۔

۱۸۴۹ء ۲۳ اپریل کو آدھی رات کے بعد گرفتاری۔ آٹھ مہینے پیترسبورگ پرانے قلعے کے حوالات میں۔ ۲۲ دسمبر کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر شہر کے باہر قتل گاہ میں کھڑا کیا گیا۔ سزائے موت کا انتظار۔ عین لمحے فرمان شاہی کہ دس سال جلاوطنی کی سزا (چار سال قید بامشقت اور باقی عرصے سرحدی پلٹن میں عام فوجی سپاہی کی خدمت)

۱۸۵۰ء ہتھکڑی بیڑی میں سائبیریا کے سنگلاخ مقام اومسک کو روانگی۔ ۱۴ دن کا مسلسل سفر طے ہوا۔ لڑکپن سے مرگی کے آثار تھے۔ سائبیریا میں بیماری زور پکڑ گئی۔

۱۸۵۴ء فروری میں قید سے رہائی۔ منگولیا کی سرحد پر روسی چھاؤنی نسمی پلاتینسک ،، میں عام فوجی کی وردی۔

۱۸۵۶ء بڑی کوششوں اور سفارشوں سے معمولی افسری پر ترقی۔

۱۸۵۷ء قیدیوں کے حالات پر ایک کہانی "چھوٹا ہیرو" اپنا نام دیے بغیر شائع کرائی۔
فروری میں ایک مقامی شخص عیسائیف کی بیوہ ماریا دمیتریُونا سے شادی کرلی۔

۱۸۵۹ء پانچ سالہ نیک نامی کے ساتھ فوجی خدمات اور عرضیوں کی بدولت شاہی اجازت مل گئی کہ ملٹن سے استعفا دے کر شہر "تویر" میں رہ سکتا ہے۔ دسمبر میں راج دھانی پیٹرسبورگ واپسی کی اجازت ملی۔

۱۸۵۹-۶۰ء دس سال کی غیر حاضری کے بعد پے در پے تین تصانیف رسالوں میں شائع ہوئیں: مزاحیہ ناولٹ "چچا کا خواب" طویل افسانہ "استیپان چی کووا گاؤں اور اس کے باشندے" اور "مُردار مکان کی یادداشتیں" تیسری تصنیف نے اسے پھر گم شدہ ادبی مقام دلا دیا۔

۱۸۶۱ء "ذلتوں کے مارے لوگ" (اونیژنی ای اَسکربلیونی یے) شائع کر دیا۔ دو جلدوں میں تصانیف کا مجموعہ نکلا۔

اسی سال رُوس کی انقلابی تحریک اور کسان شورشوں کے دباؤ سے شاہی فرمان کے ذریعے "سرفڈم" (کرے پستنایا پراوا") کا قانونی خاتمہ۔ دستوئیفسکی نے اصلاحی قدم کا خیر مقدم نہیں کیا۔

۱۸۶۲ء بڑے بھائی میخائیل سے مل کر رسالہ "زمانہ" (وریمیا) نکالا اور ترقی پسند معاصرین کے سیاسی و ادبی خیالات کی مخالفت شروع کر دی۔ "مردار مکان" پہلے رسالہ "زمانہ" پھر کتابی شکل میں۔ "ناگوار اندیشہ" (اسکویرنی انیکدوت) بھی اسی رسالے میں۔

"پوچ وین نست" (اَرضیت) کے نظریے پر زور، اور پہلی بار اڈی ٹوریل اور مختصر مضامین کے ذریعے روسی مسیحیت کی تبلیغ۔ روسی قدامت کی طرف جھکاؤ۔ گرمیوں میں مغربی یورپ کا پہلا سفر: پیرس، لندن، جنیوا۔ سماجی اصلاح اور جمہوری انقلاب کے خیالات سے صاف مایوسی۔

۱۸۶۳ء واپسی پر زوالِ مغرب کی پیش گوئی۔ "گرمیوں کے مشاہدوں پر سردیوں کے اندراج" رسالہ "زمانہ" میں۔ رسالہ حکماً بند کر دیا گیا۔ دوسرا عشق۔ یورپ کا دوسرا سفر۔

۱۸۶۴ء نیا رسالہ "دور" (ایوخا) شائع کرنے کی اجازت مل گئی۔ تمام انتظام بھائی کے ہاتھوں میں۔ "رُوپوش آدمی کی یادداشتیں" اسی میں چھپتی ہیں۔ دق کے مرض سے اپریل میں بیوی کا اور جولائی میں بھائی کا انتقال۔ رسالہ بند۔

۱۸۶۵ء بے سروسامانی میں یوروپ کا تیسرا سفر۔ یار باش محبوبہ توپلینا کا ساتھ۔ واپسی میں دو جلدوں میں مجموعہ تصانیف کی اشاعت۔

۱۸۶۶ء رسالہ "روس کی ویسیت نِک" (نقیب روس) میں ناول "جرم و سزا" کی سلسلہ وار اشاعت۔ سال کی میعاد ختم ہونے تک ناولٹ "جواری" پہلی بار اسٹینوگرافر کو بول کر لکھوایا۔ پھر یہی نسخہ "جرم و سزا" کی تحریر کے وقت آزمایا۔

۱۸۶۷ء اسی اسٹینوگرافر آنا سنیت کِن سے شادی۔ "جواری" اور "جرم و سزا" کتابی شکل میں۔ بیوی سمیت یوروپ کا چوتھا سفر۔ چار سال پھر وطن سے دُور۔ جوا خانوں اور کتب خانوں پر شام و سحر۔ کوڑی کوڑی کو محتاجی۔ ڈریسڈن (مشرقی جرمنی)، بیڈن بیڈن، جنیوا، ویوی، ملان، فلورنس (اطالیہ) ویانا۔ پراہا (چیکوسلاواکیہ) پھر جرمنی۔

۱۸۶۸ء رسالے "نقیب روس" میں ناول "ایڈیٹ" کی سلسلہ وار اشاعت۔ پہلی بچّی کی پیدائش اور دو مہینے بعد اس کی موت۔ وہ شہر چھوڑ دیا۔

۱۸۶۹ء دوسری بچّی کی پیدائش۔ یوروپ کی سیاسی تحریکات کا مطالعہ۔ انقلابیوں کی انٹرنیشنل سے سخت مایوس ہوا۔

۱۸۷۰ء فرانس اور پروشیا (جرمنی) کی جنگ — ایک طرف جرمن فوجی اسپرٹ کی ہمہ گیری، جارحانہ قومی ذہن سے، دوسری طرف فرانسیسیوں کی سرکشی سے، پیرس کیمون کے نعرۂ مساوات سے، اور ان دونوں کی لائی ہوئی بربادی سے سخت نفور۔ روس کے جلاوطن انقلابی باکونین کے مزاجی پرچار کو وہ روس کے لئے تباہ کن سمجھتا تھا اور ان حالات و خیالات کے نتیجوں سے خبردار کرنے کے لئے بڑا ناول لکھنے کی تیاری کر رہا تھا لیکن وطن سے دُور رہ کر تیاری پوری نہ ہوسکی۔ طویل افسانے "سدا سہاگی" (دیکھئے مؤثر) کی اشاعت

۱۸۷۱-۷۱ء ۸ جولائی کو پیٹرسبورگ واپس۔ آٹھ دن بعد پہلے بیٹے کی پیدائش۔ ناول "بھوت پریت" (بیسی) رسالہ نقیب روس میں چھپنا شروع ہوا۔ جسے روس کے رجعت پرستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انقلابی تحریکوں کے مخالفین کے الزامات کی اس ناول سے پوری تائید نکلتی تھی۔

۱۸۷۳ء "بھوت پریت" کتابی شکل میں نکلا۔ پرنس میشرسکی کے شاہ پرست رسالے "شہری" (دگراژدانین) کا ایڈیٹر قرار پایا۔ اسی

رسالے میں "ادیب کا روزنامچہ" (ڈنیونک پساتلا) چھپنا اور قبول عام کو پہنچنا شروع ہوا۔
بعد میں رسالے کی ادارت سے استعفا دے کر "ادیب کا روزنامچہ" ماہانہ رسالے کی صورت
میں نکالا۔ رسالہ پابندی سے نہ نکل سکا۔ تاہم کتابی صورت میں آکر یہ روزنامچہ
مستقل ادبی صحافتی کارنامہ شمار کیا گیا۔ روسی میں اپنی قسم کا یہ واحد رسالہ تھا جس
میں ایک ہی ادیب کے تبصرے، مشاہدے، مضامین اور افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔

۱۸۷۴ء کسی شاہی بیان کو بلا اجازت شائع کرنے پر سنسر کی طرف سے مقدمہ۔ دو دن کی سزا۔

۱۸۷۵ء "بھوت پریت" ناول کے فوراً بعد شروع کیا ہوا ناول "نوجوان" چھپا جس میں مصنف
نے بھٹکے ہوئے ایک نوجوان کو راہِ راست پر آتے دکھایا اور بتایا ہے کہ مسیحی اخلاق، ایمان
اور سیدھے سچے روسیوں کی حقیقت پسندی کس طرح نجات کی ضامن بن سکتی ہے۔

۱۸۷۶ء پھر یورپ کی طرف EMS کے پہاڑی چشموں پر چند روز یہاں کی آب و ہوا سے اس کے
اعصاب کو آرام ملتا تھا — اور تنہائی میں سوچنے کا وقت بھی۔

۱۸۷۷ء زارِ روس الیکساندر دوم نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ دستوئیفسکی نے جو ہر قسم کی
جنگ جوئی کے خلاف تھا "ادیب کا روزنامچہ" میں اس جنگ کی تائید کی کہ اس سے ہوا
صاف ہوگی اور ہمارے وجود کے لئے یہ جنگ لازمی ہے۔ "روزنامچہ" کی اشاعت چھ
ہزار تک گئی۔

"ادیب کا روزنامچہ" ماہانہ نکلنے لگا۔ اسی میں کئی افسانے بھی نکلے۔ جن میں سے "نیک
روح" (کروت کایا) "بڑے دن کے درخت" "حضرت مسیح کے پاس ایک چھوکرا" "مسخرے
کا خواب" نے علاحدہ کتابی صورت میں ادبی حیثیت پائی۔

۱۸۷۸ء بیٹا الکسے ئی ڈھائی سال کا ہو کر مرگی کے پدری مرض میں مر گیا۔ دستوئیفسکی نے خواب و
خور حرام کر لیا۔ صبر و سکون کی تلاش، تصوّف میں حیات و موت کے حل کی تلاش، نوعمر
متفکر ولادی میر سلوویوف سے دوستی۔ اسی کے ہمراہ شہری آبادی سے دور "اوپ تینا"
کی خانقاہ کا سفر۔ دو دن قیام۔

ماسکو کے پبلشر کتکوف نے تین سو روبل فی جزو حق تصنیف کی پیش کش کی۔ تب تک ڈیڑھ
سو سے ڈھائی سو روبل تک ملا تھا۔

رائل اکادمی آف سائینسز نے روسی زبان و ادب کا متبادل ممبر چنا۔ تصانیف کی آمدنی، گھر

نئے پبلشر اور شاہی حلقے کی سرپرستی کی بدولت معاشی افکار سے چھٹکارا ملا۔

۱۸۷۹ء "بڑے گنہگار کی سرگزشت" لکھنے کی تیاری تھی۔ اس کے ایک حصّے کے بطور "برادران کرامازوف"
قسط وار چھپنی شروع ہوئی جس میں ایک منصب دار جاگیر دار خاندان کی اندرونی زندگی اور باہر
کے حالات و خیالات سے اس کا ٹکراؤ اور اُلجھاؤ غیر معمولی گہرائی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس طرح کر
مادّیت پسندی اور لامذہبیت کے خلاف ادبی یلغار میں وہ قدامت پسندی کا ہتھیار بھی بن گیا۔
پھر EMS کے چشموں کی طرف۔ ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ سماجی سرگرمی بڑھتی جا رہی
تھی اور صحت برابر گرتی جا رہی تھی۔ پانچ گرمیوں میں اس مقام پر آرام کیا۔
بیوی اور رشتہ داروں کے درمیان جائداد کے جھگڑے۔ مصنّف جو اپنی تین چار سال کی ذہنی
کاوش کو دو برس سے کاغذ پر منتقل کرنے میں معروف تھا، گھریلو معاملات سے بدحواس —
اور بالآخر بے تعلق۔

۱۸۸۰ء "برادران کرامازوف" کا ہنگامہ خیز آخری باب "اسقف اعظم کا جواب" لکھا گیا، جو "گرانڈ اِن
کوئی زیٹر" کے نام سے ناول [اور علاحدہ کتابی شکل] میں سامنے آیا۔
دسمبر میں یہ ناول "نقیب روس" رسالے کے صفحات سے نکل کر کتابی شکل میں چھپا اور
اس کی دھوم مچ گئی۔
۸ر جون کو ماسکو میں پوشکن کے مجسّمے کی نقاب کشائی اور یادگار اجلاس میں یادگار تقریر،
جو صحافی، مترجم، ادیب، مضمون نگار، تنقید نگار اور مقرر دستوئفیسکی کی زندگی کا آخری
کارنامہ ثابت ہوئی۔
کچھ دن بعد پوری تقریر (آخری باب میں خلاصہ شامل ہے) "ادیب کا روزنامچہ" میں چھپی
اور اس کے کئی کئی ایڈیشن نکل گئے۔

۱۸۸۱ء ۲۸ر جنوری کو، پھیپھڑوں سے خون آنے کی تکلیف اتنی بڑھی کہ بے ہوشی کا غلبہ ہوا۔ آخری
لمحے انجیل مقدّس کا نسخہ وراثت میں بیٹے کو سپرد کر کے آنکھیں موند لیں۔
پہلی فروری کو نیفسکی قبرستان میں دھوم دھام سے دفن کیا گیا۔ جنازے میں تیس ہزار آدمی
سے کم نہ تھے اور دو گھنٹے تک جنازہ گزرتا رہا۔ روس کے کسی مصنّف کو قوم نے اس شان و
شکوہ کے ساتھ آخری آرام گاہ تک نہ پہنچایا تھا۔

Bibliography: The Sources Referred to

1) Russian Bol Encyclopaedia Vol XV Moscow

2) Russian Literary " Vol II 1964

3) Dostoevsky, André Gide's Lectures. 1952

4) A new biography by E.H. Carr 1949

5) Fire brand. the life of F.D. Henry Troyat 1946

6) Characters of Dostoevsky: Richard Curle 1950

7) A prophet of the Soul: Zenta Maurina 1947

8) Rusi Adab (Urdu) Vol II: Prof M. Mujeeb 1940

9) The Making of a Novelist; Ernest J. Simmon 1940

10) Dostoevsky : A. Steinberg 1966

11) The breath of Corruption An Interpetation of F.D. by:- Ivan Roe.

12) Dostoevsky' Essays and perspectives: Robrt Lord 1970

13) Freedom and the Tragic life. A Study in Dostoevsky:- by: Vyacheslav Ivanov 1952

14) Dostoevsky: His Life and Art: Avrahm Yarmolinsky 1957

15) Dostoevsky: a Collections of Critical Essays 1963

16) Dostoevsky: an Examination of the Major Novels Richard Peace 1971

17) Dostoevsky Ed. René Wellek N.J. USA 1963

18) F. Dostoevsky J. Middleton Murry 1923

19) Dostoevsky : by Prince D.S. Mirsky London

20) History of Russian Literature (Prose) Vol XIX Cent. 1962

21) F.M. Dostoevsky: B.V. Yermilov, Progress Publishers MOSCOW

22) F. Dostoevsky : C.M. Woodhouse 1961

23) The Undiscovered Dostoevsky: Ronald Hingley, H. Hamilton. UK. 1962

24) "Pisma" (Collection of letters) Moscow. London

25) Dostoevsky - a Study - Janko Lavrin 1943

26) F. Dostoevsky A Self Portrait, Jessie Coulson 1962

27) Complete Set of the Writings of F.D. Moscow (1970-76)